

"http://Pakfunplace.com"

Online Free Urdu/English Novels
one provides to USERS Urdu and
English books/Novels/Digests
Free Online download. A place
for Urdu and
English books/Novels/Digests
Lover where They can find
all types of books/Novels/Digests.
Get all the Free Downloads of
Urdu Novels, English Novels,
Islamic History Books,
Monthly Digests, Animes,
t.v Series Online in fastest
"Resumable Mediafire Links"...



طاوعد
زروب
احمد نیر محمد قاسمی

<http://www.pakfunplace.com>

طلوع و غروب

احمد ندیم قاسمی

پیرزادہ محمد حیات قاسمی

کے نام

اس دلاویز رات کی یاد میں

جب ہم نے اپنے گاؤں کے مغرب میں ایک
اندھی گہری کھاڑی میں چھپ کر سوئے ہوئے جنگلی
کبوتروں پر اندھیرے میں قائر کئے تھے اور جب
واپسی پر ہم نے اپنی اس عجیب و غریب حرکت کے
حق میں صرف یہ دلیل پیش کی تھی کہ ۔
تاروں کا گوشہ شمار میں آنا محال ہے
لیکن کسی کو خند نہ آئے تو کیا کرے

ندیم

ترتیب

15	طلوع و غروب	1
51	کنکلی	2
60	فقیر سائیں کی کرامات	3
68	گونج	4
83	جلسہ	5
94	میرادیس	6
102	جوانی کا جنازہ	7
127	پکا مکان	8
142	چھاگل	9

دیباچہ

چند احباب نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں وسطی اور مشرقی پنجاب کے دیہات کی زندگی کے متعلق بھی کہانیاں لکھوں کیونکہ ان کے خیال میں میرے افسانے شمال مغربی پنجاب کی سطح مرتفع اور مغربی پنجاب کے ”تھلوں“ میں محدود ہو کر رہ گئے ہیں اور ان میں مقامی رنگ کی اتنی افراط ہے کہ وسطی اور مشرقی پنجاب کے دیہات میں رہنے والے ان سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ شمال مغربی پنجاب سے زیادہ میں نے دنیا کے اور کسی حصہ کا اتنا گہرا مطالعہ نہیں کیا اور جہاں تک مجھے پنجاب کے دیگر اضلاع کو دیکھنے کا موقع ملا ہے، میں نے دیہی زندگی کے بنیادی اصولوں میں کوئی اختلاف نہیں پایا۔ گاؤں میرے افسانوں کے لیے صرف پس منظر کا کام دیتا ہے اور اس میں رہنے بنے والے انسان میرے افسانوں کے کردار ہیں۔ انسانی دل کی دھڑکن دنیا کے ہر حصے میں یکساں ہے، دکھ سکھ کا قانون ہندوستان کے دیگر حصوں اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی وہی ہے جو ان دیہات میں رائج ہے۔ پہاڑوں

کی پگڈنڈیوں اور ریگزاروں کے ٹیلوں کا ذکر کرنے سے یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ان پہاڑوں اور ریگزاروں میں رہنے والے نسل آدم کی بجائے کسی دوسرے سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں اور پھر جس ماحول کے متعلق لکھنے والے کا مطالعہ نسبتاً گہرا ہے اسے پس پشت کیوں ڈال دے اور ان دیہات کے متعلق کیوں لکھے جن کی بولی ٹھولی اور رسم و رواج سے وہ ایک حد تک ناواقف ہے۔ ضروری امر ہے کہ وہ اس طرح ادب کا پورا حق ادا نہ کر سکے گا اور صنوبروں کو میدانوں میں اور کھجوروں کو پہاڑوں پر لہراتا دکھا دے گا۔ مقامی رنگ پیش کرنے کی بنا پر اگر دنیا کے ہر ادیب اور شاعر کو گردن زدنی قرار دیا جائے تو وہ کونسا ”خوش نصیب“ ہے جو بچ نکلے گا۔ ٹامس ہارڈی کے ناول جزائرِ برطانیہ کے ایک خاص حصے میں محدود رہ کر بھی اپنے اندر کائناتی جاذبیت رکھتے ہیں اور ٹیگور کی کہانیاں اور نظمیں پرانے ہندو کلچر کی آئینہ دار ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں اور عیسائیوں وغیرہ کے لیے بھی سرمایہ فکر و نشاط ہیں!

میں نے دیہات کے موضوع پر صرف اس لیے قلم اٹھایا تھا کہ پنجاب کے دیہات کو صحیح رنگوں میں پیش کرنے والا مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ جن چند نفوس نے اس طرف توجہ کی، (اور مجھے اعتراف ہے کہ ان کی نیت میں خلوص تھا) وہ دیگر بے شمار مصروفیتوں میں گھر کر اپنے بھائیوں سے غافل ہو گئے یا صحیح الفاظ میں غافل کر دیئے گئے۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی اصطلاحوں سے بلند ہو کر میں نے اپنے غیور، غریب اور محنتی بھائیوں کے احساسات و جذبات کو کہانیوں کی صورت میں پیش کرنے کی سعی ہے۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ میں اس کوشش میں کامیاب رہا ہوں یا ناکام۔ میرے لیے یہی اطمینان کافی ہے کہ میں نے ان بے زبانوں کی نمائندگی کی ہے جن کی زندگیاں محبوس ہیں اور جن کے لبوں پر رواج اور قانون نے مہر لگا رکھی ہے۔ بلاشبہ زندگی کے ہر شعبے کی ترجمانی کا فرض ادیبوں پر عائد ہوتا ہے لیکن ان

فرائض کی تقسیم کیوں نہ کر لی جائے، شہری شہروں کے متعلق لکھیں اور دیہاتی دیہات کے متعلق! ایک پنجابی اگر پنجاب میں رہتے ہوئے یوپی، بہار، بنگال یا دکن کے باشندوں کی زندگیوں کا جائزہ لینے لگے اور اگر ایک دکنی، سرحد کے پٹانوں کے متعلق لکھنے بیٹھ جائے تو گو مقصد نیک ہے لیکن کامیابی موهوم!

جس شخص نے چوپالوں پر بیٹھ کر غریب کسانوں کے ساتھ حقے کے کش لگائے ہوں اور چرواہوں کے ہمراہ دور افتادہ گھائیوں اور ویران میدانوں میں گھومتا پھرا ہو، وہ ٹھنڈی سڑک کے آس پاس بکھرے ہوئے بنگلوں کی اندرونی زندگی کے متعلق کیا خاک لکھے گا اور جو شخص گونجتے ہوئے ایوانوں میں نرم و گداز صوفوں پر بیٹھنے کا عادی ہو اور کانٹا چھری کے بغیر جسے پیٹ بھرنا اجیرن ہو جائے، وہ ننگ دھڑنگ دہقانوں کی پھٹی ہوئی اڑیوں، کھردری انگلیوں اور پھڑپھڑاتے ہوئے چیتھڑوں کا تجزیہ کیسے کر سکے گا؟

کئی حضرات کو شکوہ ہے کہ اول تو میں ”رنگینیوں“ سے کتراتا ہوں اور اگر اپنی شاعرانہ افتاد طبع کے زیر اثر اس طرف جھکوں بھی تو آخر کار پھر انہیں اندھیروں میں ڈوب جاتا ہوں۔ ان کا خیال ہے کہ میری تحریریں سرتاپا ”رنگین“ ہونی چاہئیں!

میں انہیں صرف یہی کہوں گا کہ ————— ”میں نے پھٹے ہوئے ہونٹوں سے آہوں کے دھوکے اٹھتے دیکھے ہیں۔ میں نے موت کی چڑیلوں کو تیرہ نصیب مریضوں کے سرہانے دانت کچکچاتے اور انگلیاں چٹختے دیکھا ہے۔ میں نے زندگی کی نعش کو گلے سڑتے دیکھا ہے۔ میں نے پھول کی نرم پتیوں پر کانپتے ہوئے اوس کے موتیوں کو اس قدر غور سے نہیں دیکھا جتنا گرد آلود پتلیوں میں اٹکے ہوئے دھندلے آنسوؤں کو —————! میں نے کلکاریاں مارتے ہوئے ان امیر بچوں کی طرف اتنی توجہ نہیں دی جو گدگدے ہنڈولوں میں جھولتے رہے بلکہ میں نے غریبوں کی اس روتی اور ہلکتی ہوئی اولاد کو نہایت قریب سے دیکھا

ہے جسکی دجیوں سے بدبو آتی ہے، جس کی آنکھوں سے کئی دن کا غنونت خیز میل چپکا رہتا ہے اور جس کی ہنسی میں بھی مجھے غم و اندوہ کے بھٹنے تالیاں بجاتے نظر آتے ہیں! — اور پھر تم مجھ سے رنگ و بو کے طلبگار ہو۔ تم کہتے ہو میں اندھیروں میں بھٹک رہا ہوں۔ لیکن اے روشنیوں میں رہنے والو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اسی اندھیرے میں تمہاری طرح کے منہ ناک اور ہاتھ پیر رکھنے والے لاتعداد انسان ازل سے ٹاک ٹوئے مار رہے ہیں، لیکن انہیں تمہارے دربار سے روشنی کی ایک کرن تک نصیب نہیں ہوئی!“

اس لیے میری کہانیوں کے پس منظر سے نامانوس حضرات انہیں صرف اس نظر سے پڑھیں کہ اسی سرزمین میں ایک ایسی جماعت بھی آباد ہے جو باسی روٹی اور پیاز سے پیٹ بھر کر بھی طاقتور رہ سکتی ہے۔ جس کے پسینے کی کمائی کو کوڑیوں کے مول خرید کر اس پر مکھن اور شکر چڑھا کر وہ پر تکلف ریستورانوں میں داد عیش دیتے ہوئے سیاسیات عالم پر طویل بحثیں کرتے ہیں اور جس کی زندگی کا ہر لمحہ سرمایہ داروں اور زمینداروں کے حکم کا تابع ہے۔ لیکن جسے شرافت اور عصمت کی حفاظت کے لیے اپنا سر کٹا دینے میں کوئی باک نہیں ہوتا!!

لاہور

احمد ندیم قاسمی

۲۷ / دسمبر ۱۹۴۲ء

طلوع و غروب

طلوع و غروب

سنہرا غبار

ٹیلوں پر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور دور کھجوروں کے ایک جھنڈ میں کوئی پنچھی سہمی سہمی تانیں اڑا رہا تھا۔ میں اس صحرا میں شکار کھیلنے آیا تھا۔ میرا بوڑھا ملازم سو گیا تھا اور چونکہ پردیس میں مجھے نیند بہت کم آتی ہے اور صحراؤں کی چاندنی راتیں سونے کے لیے نہیں بلکہ جاگنے کے لیے ہوتی ہیں اس لیے پہلے تو میں بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا مگر جب کھجوروں کے جھنڈ میں کسی پرندے کی دکھی دکھی سہمی سہمی تانیں سنیں اور پھر ان میں کسی بھاگتی ہوئی خوفزدہ دوشیزہ کے گھٹکریا لے بالوں کی طرح لہراتا دیکھا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے کتے اپنے دھن دھن ہلانے لگے اور طلائی ریت ان کی دھنوں کی ہر حرکت پر اڑنے لگی ایک اونچے نیچے پر چڑھ کر میں نے چار سو نگاہیں دوڑائیں۔ اکا دکا کھجوروں کے آسپی سائے اور سائیں سائیں کرتی ہوئی خاموشی کے سوا تھائی کے اس لقا و دقا براعظم میں اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔ میں ٹھنڈی ریت کو ٹھیکوں میں دبا کر اسے ہولے ہولے نیچے گرانے لگا۔ ریت کے ننھے ننھے جینار سے ابھر آئے اور میں سوچنے لگا کہ اگر خدا نے زمین کا اس قدر طویل اور

عریض نکلا ریت اور صرف ریت کے لیے وقف کیا ہے تو آخر اس کا مقصد! — یوں کیوں نہ ہوا کہ یہاں سرسبز اور شاداب کھیت ہوتے۔ گیہوں کی سنہری بالیاں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ایک انداز بے نیازی سے اپنی گردنیں خم کر دیتیں اور سارا منظر کوؤں کی روں روں اور چشموں کے دبے دبے نعروں سے لبریز ہوتا — یا یوں کیوں نہ ہوا کہ یہاں اونچے اونچے پہاڑ ہوتے، جن پر باند صنوبروں کے جنگل ہوتے۔ ننھی ننھی ندیاں چٹانوں پر سر پٹختی، جھاگ کے بادل اڑاتی زخمی ناگنوں کی طرح لہراتی پھرتیں اور ڈھلانوں پر لہجہ وہاں پتلی پتلی اگلیوں میں موٹی موٹی بنریاں تھامے گلابی ہونٹوں کے ایک ذرا سے مس سے فضاؤں میں موسیقی کا رس گھولتیں — یا یوں کیوں نہ ہوا کہ یہاں بڑے بڑے شہر — میرے خیالات کی پرواز اچانک رک گئی اور چاندنی کے سینیں اندھیرے میں مجھے اونٹوں کی گھنٹیوں کی دھیمی دھیمی صدائیں سنائی دیں۔ خاموشی کے اس سمندر پر ان سریلی آوازوں کا سفینہ تیرتا ہوا آیا اور میرے احساسات کے ساحل سے ٹکرانے لگا اور اچانک میرے ذہن پر پرانے زمانے کے ایک قافلے کے نقوش ابھرنے لگے — اونٹوں کی دور افق میں گم ہوتی ہوئی قطار — ہدی خواں — ساریاں — محلوں میں بیٹھی ہوئی حسین دوشیزائیں جن کے پھول سے کانوں کی لوہوں میں چاندی کے بندے اونٹ کے ہر ہچکولے پر پھڑکتے تھے — اور جن کے ابھرے ہوئے سینوں پر دبی ہوئی امنگیں سسے سسے گیت بن کر محل کے پردوں کے آس پاس گھومتی رہتی تھیں۔

کھجوروں کے جھنڈ میں بے نام پرندے نے ایک تان اڑائی اور خاموشی کے سینے پر جیسے ایک تیز نشتر چلا دیا۔ قافلہ ہولے ہولے قریب آتا گیا۔ اونٹوں اور ساربانوں کے خطوط واضح ہوتے گئے اور اب کبادوں میں کبھی کبھی ایک چمک سی بھی نظر آ جاتی تھی جو شاید چاند کی کرنوں کے، دوشیزاؤں کے

بندوں کو چومنے سے پیدا ہوتی تھی۔ میرے شکاری کتے زور زور سے بھونکتے ہوئے اونٹوں کی طرف لپکے۔ میں انہیں روکنے کی کوشش میں ان کے ساتھ بھاگنے لگا لیکن قافلہ کتوں کے خوف سے بے پروا آہستہ آہستہ ریختا چلا گیا۔ بیتل کی گھنٹیاں اسی طرح مٹناتی رہیں اور کسی ساربان کا یہ گیت کتوں کی کرخت آوازوں سے لپٹا دھندلی سنہری فضا پر تانوں کے ملائم تار پھیلتا بدستور جاری رہا:

اے کالی راتوں میں لمبے لمبے ڈگ بھرنے والے خوفناک بھوتے۔ میں تمہاری ہڈیوں کی چیخ اور دانتوں کی کچکچاہٹ اور آتشیں سانسوں کے بگولوں سے ذرہ بھی نہیں گھبراتا۔ کیوں کہ میں اپنی محبوبہ کے ساتھ جا رہا ہوں!

اے وسیع صحراؤں پر گرجنے والے بادلو اور کڑکتی ہوئی بجلیو! میں جانتا ہوں کہ تمہارے خوف سے بوڑھے درخت چیخ رہے ہیں اور کھلی فضا میں تھرا رہی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ نالے چڑھنے والے ہیں اور پگڈنڈیاں مٹنے والی ہیں۔ لیکن میں بالکل ہراساں نہیں کیوں کہ میں اپنی محبوبہ کے ساتھ جا رہا ہوں!

اے چاندنی سے دھلے ہوئے ٹیلے پر بیٹھی ہوئی اجنبی عورت! مجھے اپنی طرف بلانے کی کوشش نہ کر۔ میں جانتا ہوں کہ تیرے بال ساون کی گھٹاؤں کی طرح سیاہ ہیں۔ تیری آنکھوں میں پہاڑی جھیلوں کی سی گہرائیاں اور سیاہیاں ہیں۔ تیرے ہونٹ گلاب کی نومیدہ پنکھڑیاں ہیں۔ تیرے گال ریشم کی طرح نرم اور شفق کی طرح نارنجی ہیں۔ تیرا سارا جسم کنوارے نوجوانوں کے خوابوں کے مشابہ ہے۔ لیکن

میں تیرے بس میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ میں تجھ سے کہیں اچھی محبوبہ کے ساتھ جا رہا ہوں!

ایک جگہ پر جا کر میں نے کتوں کو روک لیا اور انہیں دھتکار کر خیمے کی طرف بھگا دیا۔ اب اونٹ میرے سامنے سے گزر رہے تھے۔ کبادوں پر بندوں کی چمک بڑھ گئی تھی اور اونٹوں کی گھنٹیاں سینکڑوں جل ترنگوں کی طرح بج رہی تھیں۔ مجھے بھی اسی ریگزار کے کسی گاؤں تک پہنچنے کی آرزو تھی۔ شکار کی دُھن میں شام پڑ گئی تھی اور رات بھر کسی گاؤں کی تلاش میں ٹیلوں پر بھٹکتے پھرنے کے بجائے میں نے بیس خیمہ تان لینا مناسب سمجھا تھا۔ اس لئے آواز دی۔ ”بھئی کس گاؤں جائے گا یہ قافلہ؟“

چند ساربانوں نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور بیک زبان بولے۔ ”سوسن“

میں بھاگ کر ایک ساربان کے پاس گیا اور کہا۔ ”بھئی مجھے بھی سوسن جانا ہے۔ شکار کھیلنے آیا تھا‘ رات پڑ گئی۔ رستہ معلوم نہ تھا۔ تم اگر میرے لئے کچھ دیر انتظار کر سکو تو میں سب سامان لے کر تمہارے ساتھ چلا چلوں۔ کل دن کو میں کس سے راستہ پوچھتا پھروں گا۔“

ساربان جس نے منڈا سے منہ چھپا رکھا تھا۔ بولا۔ ”ہرج تو کوئی نہیں لیکن۔“ اور وہ کچھ دیر سوچ کر زور سے پکارا۔ ”ہے گلاب خاں۔ یہ ایک مسافر ہے بیچارا۔ کتا ہے مجھے بھی سوسن لے چلو۔ کہو تو چند گھڑیاں یہاں دم لے لیں۔“

اور قافلے کے اگلے سرے سے آواز آئی۔ ”کون ہے یہ مسافر؟“

اور ساربان نے جواب دیا۔ ”کوئی شکاری ہے۔“

ادھر سے گلاب خاں نے آواز دی۔ ”ٹھہر جائیں گے‘ تم اس سے کہو ذرا جلدی کرے‘ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ رات کو پو پھٹنے سے پہلے پہنچ جانا

چاہیے۔ تاروں کی چھاؤں میں!“

قافلہ رک گیا۔ گھنٹیوں کی آوازیں مدھم پڑ گئیں۔ کبادوں پر چھپے سے سنائی دینے لگے اور میں اپنے خیمے کی طرف بھاگا۔ میرا ملازم خیمے سے باہر میرا انتظار کر رہا تھا۔ بولا۔ ”آپ کدھر نکل گئے تھے؟ راتوں کو ان ریگستانوں میں بھوت پریت کھلا کرتے ہیں۔ آپ کو تو اپنی جان کی کچھ پروا ہی نہیں!“

کتے میرے قدموں میں لوٹنے لگے اور میں ملازم کی پیٹھ تھپکاتے ہوئے بولا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ یہ قافلے والے یہاں ایک گاؤں سوسن میں جا رہے ہیں۔ خیمہ لپیٹو۔ بندوق سنبھالو اور چلو میرے ساتھ۔ بھوت پریت کا قصہ چھوڑو۔ یہ سب واپس ہے۔“

اب میرا ملازم تیزی سے خیمے اکھڑتے ہوئے کہنے لگا۔ ”واہمہ تو نہیں آقا۔ ساری دنیا پر روشن ہے کہ ان ٹیلوں میں بہت سے شکاری آئے اور دیوانے ہو کر واپس گئے۔ ابھی کل کا واقعہ ہے کہ نواب ریحان خان کا بیٹا ادھر شکار کھیلنے آیا اور جب واپس گیا تو کھویا کھویا۔ حکیموں سے مشورے کئے گئے۔ جواب ملا یہ کوئی مرض نہیں۔ بھوت پریت کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ ایک اندھیری رات کو گھر سے نکل بھاگا۔ اس روز قیامت خیز آندھی آئی اور اس میں ایسا کھویا کہ پھر لوٹ کر نہ آیا۔ آپ تو میری ہر بات کا مذاق اڑا دیتے ہیں!“

انہی باتوں میں خیمہ لپیٹ لیا گیا اور ہم قافلے کی طرف بڑھے۔ ٹیلے کے دامن میں کچھ اونٹ بیٹھے سستا رہے تھے۔ کچھ گردن موڑے ہماری طرف دیکھ رہے تھے اور کئی چپ چاپ کھڑے جیسے کبادوں میں بیٹھی ہوئی دو شیرازوں کی باتیں سن رہے تھے!

منڈا سے والا نوجوان میرے انتظار میں تھا۔ میرے پہنچنے ہی اس نے گلاب خاں کو کوچ کرنے کو کہا اور قافلہ ہولے ہولے ٹیلوں کے درمیان ریگنے لگا۔ ”کہاں سے آرہے ہیں آپ لوگ؟“ میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

”سمن سے۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم نے اپنے گاؤں کے لئے پھولوں کے سے نام کیوں چن رکھے

ہیں۔ سمن، سوسن بہت پیارے نام ہیں یہ۔“

اور وہ بولا۔ ”یہاں پھول نہیں ملتے نا۔ اس لئے!“

میرا ملازم بھاری خیمے کو ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر منتقل

کرتے ہوئے بولا۔ ”یہاں پھول نہیں ملتے اس لئے! کیا مطلب!“

اور ساربان اپنی آنکھوں پر سے منڈا سا اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”تم

شہروں میں رہنے والے اپنے باغوں میں ننھی ننھی مصنوعی پہاڑیاں اور چھوٹے

چھوٹے ریت کے قطعے بنا لیتے ہو کہ وہاں پہاڑ اور ریگستان نہیں ہیں۔ ہم

ریگستانوں والے اپنے گاؤں کو پھولوں کے نام اس لئے دیتے ہیں کہ یہاں پھول

نہیں ملتے۔ بات ایک ہی ہے۔ جو چیز حاصل نہ ہو سکے اس کا نام لینے سے دل کو

تسلی ہوتی ہے۔ ہم سمن سے آرہے ہیں۔ ہم سوسن جا رہے ہیں۔ کیا تمہیں ان

ناموں میں کوئی کیف، کوئی رس محسوس نہیں ہوتا!“

اور میں ہنستے ہوئے بولا۔ ”کتوں کے باورچی کو پھولوں سے کیا لگاؤ!

—الو کیا جانے کہ دن کی روشنی کیا چیز ہے! بیٹھے کو کیا معلوم کہ.....“

اور بوڑھا میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو تو مذاق اڑانے میں

بہت مزا ملتا ہے۔ ابھی تو مجھے آپ نے الو اور۔ مہینسا بنایا ہے۔ اب اگر میں

آپ کو نہ ٹوکتا تو خدا جانے آپ میرے لئے کیا کیا نام تجویز کرتے!“

”گھن چکر۔“ میں بولا۔ ساربان اور میں زور زور سے قہقہے لگانے

لگے اور جب ہمارے قہقہے ختم ہوئے تو میں نے کجادے پر دبی دبی ہنسی سنی۔

پلٹ کر میں نے اوپر دیکھا اور نئے لباسوں کو بے چینی سے ارد گرد لپیٹتی ہوئی

لڑکیاں سمٹ سمٹ گئیں۔ میرے دماغ پر ہلکی ہلکی نسیم سی چلنے لگی جس سے

میرے احساسات کی کونپلیں جھک گئیں اور دیر تک میرے خوابوں کے پھول

اپنی پنکھڑیاں پھڑپھڑاتے رہے، اور جب مجھے سکون سا محسوس ہوا تو ساربان

اور میرا ملازم بھوت پریت کی باتیں کرنے لگے۔ ”بھوت تو خیر بھوت ہوئے۔“

..... میرا ملازم کہہ رہا تھا۔ ”لیکن یہ پریت کا کیا مطلب!“

ساربان بولا۔ ”پریوں کو کہتے ہیں نا۔“

”اور پریاں کیا چیز ہوتی ہیں؟“ میرے ملازم نے پوچھا۔

”پریاں؟“

”ہاں۔ پریاں۔ اور یہ خیمہ تو اوپر کسی کجادے میں لگا دو۔“

ساربان نے ہنستے ہوئے خیمہ اس کے کندھوں سے اتارا اور اسے اوپر

کجادے کی طرف اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”لے زرس تو اپنے آگے رکھ لے یا ادھر

نسرین کو دے دے!“

میرا ملازم ایک لمبی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”ہاں تو کیا ہوتی ہیں

پریاں؟“

”پریاں؟“ ساربان سوچنے لگا۔ ”پریاں خوب صورت لڑکیاں

ہوتی ہیں۔ ان کے سنہرے پر ہوتے ہیں۔ وہ ہواؤں میں تیرتی رہتی ہیں اور

جب ان کا سایہ کسی پر پڑ جائے تو وہ اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے۔“

اور میں لاشعوری طور پر کجادے کے سائے سے ہٹ کر ایک طرف ہو

گیا۔ خوبصورت لڑکیاں۔ سنہرے بالوں والی۔ جادو بھرے

سایوں والی۔ اور اچانک یہ خیال میرے دل میں چھپنے لگا کہ کہیں میں بھوت

پریت کے بس میں تو نہیں آگیا!۔ یہ زرد سنسناتی ہوئی چاندنی۔ یہ

گھنٹیوں کی خوابناک ننٹناہٹیں۔ یہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اونٹ

۔ یہ ہواؤں میں تیرتی ہوئی پریاں۔ یہ سمن سے آنے والا اور سوسن

کو جانے والا قافلہ۔ یہ عجیب دنیا ہے! میں گھبرا سا گیا۔ لیکن اچانک میرے

ہم سفر ساربان نے کانوں پر ہاتھ رکھا اور یہ گیت گا کر مجھے پھر انہی ریتلے

میدانوں میں لے آیا:

اے کھجور کی ڈالی پر پھدکتی ہوئی مولن۔ اڑ جا اور اپنے مولے کا کسی اور کھجور پر انتظار کر کہ اس کھجور کے تلے آج میری محبوبہ آئے گی!
اے کھجور کی ڈالیو! ہولے ہولے جھولو اور اپنے سوکھے ہوئے پتوں کو کھڑکھڑاؤ نہیں کہ آج یہاں میری محبوبہ آئے گی؟

اے تیز و تند ہواؤ! ان شاخوں سے لپٹ لپٹ کر سرسراؤ نہیں اور اس بوڑھے تنے میں گھس کر سیٹھاں نہ بجاؤ کہ آج یہاں میری محبوبہ آئے گی! اے ستارو! روشنی کی پھواریں برساؤ۔ اور اے تیرے اپنے پروں کی ایک سیج بچھاؤ کہ آج یہاں میری محبوبہ آئے گی!

”کس کا گیت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا اپنا“ وہ بولا۔

”اچھا تو تم گیت بھی بنا لیتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ وہ بولا۔ ”جب چاندنی راتوں میں ایک تنہا نوجوان اونٹ کی ٹکیل تھامے وسیع میدان میں کسی دور کی منزل کو جا رہا ہو تو وہ گیت بنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن بنانے والوں کو ایک اور چیز بھی تو چاہئے۔“

”کجا دوں پر کنواری لڑکیاں بیٹھی ہیں!“

اور یہ موضوع یہاں ختم ہو گیا۔

”کس کی برات ہے؟“ میرے ملازم نے پوچھا۔

اور ساربان نے جواب دیا۔ ”سمن کے سفید پوش کے بیٹے کی۔“

ہم سمن کے ایک بہت ہی غریب گھرانے میں جا رہے ہیں۔“

”یہ کیوں؟“ میرے ملازم نے پوچھا۔

ساربان میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔ ”بھوت پریت کا اثر ہے!“

— اور اوپر کجاووں میں نئے لباس سرسرائے۔ اور جب ہم سمن کے قریب پہنچے تو دور ہمیں بہت سی لالٹینیں نظر آئیں۔ ادھر سے گولے چھوٹنے لگے، برات کے اگلے سرے پر ڈھول اور شہنائیاں بجنے لگیں، اونٹوں کے گھٹنوں اور گردنوں کیساتھ گھنگروں کے ہار باندھ دیئے گئے اور مختلف سریلی آوازوں سے میدان میں ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔ ساربان نے مجھ سے پوچھا۔

”رات کہاں بسر کریں گے آپ؟“

اور میں نے جواب دیا۔ ”میری یہاں کوئی جان پہچان تو ہے نہیں۔ میں تو گاؤں اس لیے آیا ہوں کہ یہاں کھانے پینے کی چیزیں مل جائیں گی۔ یہیں باہر کسی کھیت کے کنارے خیمہ تان لوں گا۔“

وہ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ ”کیا ضرورت ہے خیمہ کھڑا کرنے کی۔ میرے ہاں پڑ رہے گا۔ ہم تو گانے ناچنے لگ جائیں گے اور پھر آپ بھی مسافر، ہم بھی مسافر۔ سب مسافر ہم وطن ہوتے ہیں۔“

”بہت اچھا۔“ میں نے کہا۔ شاید میں انکار کر دیتا۔ لیکن وہ شاعر تھا اور شاعروں کے متعلق میں نے جو کچھ کتابوں پڑھا ہے اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ بہت حساس ہوتے ہیں۔

گو اس رات مجھے نیند نہ آئی لیکن مجھے ایک سادہ سا بستر مل گیا اور شہنائیوں ڈھولوں اور باجوں تاشوں کی گونج میں میں سوچتا رہا کہ منڈب دنیا سے دور رہنے والے ان ان پڑھ ساربانوں کو مسافر نوازیوں کس نے سکھا دیں! مجھے اچھے طرح یاد ہے کہ جب میں پہلی بار دہلی گیا اور وہاں چاندنی چوک میں ایک صاحب سے کشمیری دروازہ کا راستہ پوچھا تو وہ ناک بھوں چڑھا کر بولا۔

”ادھر چلے جائیے اور پھر ادھر مڑ کر سیدھے چلے جائیے گا!“ — اور جب میں نے ادھر دیکھا تو ایک بلند اور وسیع عمارت کھڑی تھی۔ ادھر ایک چھاپہ خانہ تھا اور سامنے ناک کی سیدھ میں وہی ٹریموں کی کھڑکھڑاہٹوں سے لبرر چاندنی

چوک!

— سمن کا رہنے والا یہ نوجوان کتنی محبوب شخصیت کا مالک ہے! اور کتنا اچھا گاتا ہے! اور اس کے گیتوں میں کتنا رس اور کتنی مٹھاس ہے! اور وہ کجادوں میں بیٹھی ہوئیں عورتیں جنہوں نے برات کے اچانک رک جانے پر ذرہ بھر بھی برا نہ مانا۔ اور وہ قافلہ سالار گلاب خاں جس نے ایک اجنبی کے لیے دیران صحرا میں قافلے کا قافلہ روک لیا۔ اور پھر یہ کھلے میدان اور ابھرے ہوئے ٹیلوں پر چھٹکی ہوئی چاندنی۔ یہ چالیس پچاس گھروں والا ننھا سا گاؤں۔ یہ ڈھول اور شہنائیاں۔ یہ خالص کھدر کا بستر اور یہ پرانی بھونڈی لائینیں۔ کتنی پیاری ہے یہ دنیا اور کتنی پاک ہے اس کی فضا! سوچتے سوچتے میں اپنے بستر سے اٹھا اور دروازے پر کھڑے ہو کر سامنے نظریں دوڑائیں۔ لمبے لمبے شعلے اچھالتی اور دھواں اڑاتی ہوئی مشعلوں کے ارد گرد نوجوان دھقان گھوم رہے تھے اور پاس ہی ایک گھر سے کنواریوں کے گانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں ہولے ہولے قدم اٹھاتا مجمع کے قریب پہنچا۔

نہیں کی طرح بھتی ہوئی پرانی ڈھولک کے ارد گرد سب ناچ رہے تھے۔
 مشعلیں ان سب کے چہروں پر آگ سی لگا رہی تھیں اور بہت پرے کچے
 گھروندوں کی چھتوں پر نوجوان لڑکیاں — اور آس پاس سٹڈنٹ بیروں پر
 شریر بچے دم بخود بیٹھے گیت سن رہے تھے اور ناچ دیکھ رہے تھے۔ چوڑے
 تلووں اور پھٹی ہوئی ایڑیوں کے پے بہ پے پیچ سے ڈھولک بجانے والے کے
 ارد گرد ایک گولا سا منڈلا رہا تھا اور پھپھڑوں کی پوری قوت سے نکلی ہوئی
 صدائیں سنہرے غبار میں گر جتی اور ٹیلوں سے ٹکراتی کائنات سے جیسے لپٹی
 پڑتی تھیں۔

تھالی میں کٹورا دھرا ہے پگھٹ کے پانی میں تیرا چہرہ کانپ رہا ہے۔

ناپتے ہوئے قدم رک چکے تھے اور ڈھولک بجانے والا ڈھولک کی گریں تن رہا تھا۔ سب لوگ چپ چاپ کھڑے مجھے گھور رہے تھے جیسے میں

پرانے زمانے کی داستانوں کا ہیرو، ہوں اور لنگادھپ کے جنوں اور پریوں کی قید سے نکل کر آیا ہوں۔

میرے ساربان دوست نے مجھے میری اقامت گاہ تک پہنچا دیا اور کہا۔
”آپ آرام کریں۔ صبح سویرے آپ کو جگا دوں گا۔ اس وقت آپ کیا چیز پینے کے عادی ہیں؟“

”پتلی چھاچھ۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور وہ ہنستا ہوا دور ناپچنے والوں کے ٹھکٹ میں مل گیا۔

میں بستر پر دراز تھا اور اس عجیب و غریب ماحول کی لطافتوں اور سحر انگیزیوں کے متعلق سوچ بچار میں مصروف تھا کہ اپنے قریب مجھے چوڑیوں کا ایک چھناکا سا سنائی دیا۔ میں سر سے پاؤں تک چادر میں لپٹا پڑا تھا اور اپنے خیالوں کی دنیا میں محو پرواز تھا، اس لیے اس چھناکے کو داہمہ سمجھ کر کروٹ بدل لی۔ لیکن اچانک میرے کاندھے کو کسی نے چھوا اور ساتھ ہی دھیمی سی آواز آئی۔ ”سنبل۔۔۔ سنبل! تم تو کہتے تھے کہ مجھے آج رات نیند ہی نہیں آئے گی؟“

میرے خیالوں کی جنت میں صرف ایک حور کی کمی تھی جو اب پوری ہو گئی۔ لیکن پردیس میں ایک اجنبی لڑکی کو اپنے اس درجہ قریب پا کر میں گھبرا سا گیا۔ چادر منہ پر سے اتار پھینکی اور کھٹ پر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”نیند تو مجھے بھی نہیں آتی لیکن میں سنبل نہیں، میرا نام غنفر ہے!“ اور میرا بھاری بھر کم نام سن کر وہ بجلی کی تیزی سے پٹی اور لپک کر مکان سے باہر نکل گئی!

”اچھا تو یہ بات ہے!“ میں نے سوچا اور کالی چھت کے نیچے بھونڈی لالٹین کی زرد روشنی میں میں نے اپنے آپ کو الف لیلہ کا ایک نوجوان شہزادہ سمجھنے لگا جو شکار کے بہانے ملک اندام لڑکیوں سے کھیلتا پھرتا ہے۔ جسے شرمیلی کنواریاں رات کے اندھیرے میں شانہ پکڑ کر ہلاتی ہیں اور جس کے اشارے

سے قافلے ایک دم رک جاتے ہیں! میں نے محسوس کیا کہ میری روح کے نہاں خانے میں جگنو چمکنے لگے ہیں، بالکل اس طرح جیسے دہلی میں ایک بار چمکنے تھے۔ میں نے وہاں ایک نفیس بالا خانہ کرایہ پر لے رکھا تھا۔ مقابل کی عمارت میں ایک انکم ٹیکس افسر رہتے تھے جن کی لڑکیاں اکثر چھت پر چڑھ کر کشیدہ کاڑھا کرتی تھیں۔ اور جب کشیدہ کاڑھتے کاڑھتے تھک جاتی تھیں تو سہگل کے گائے ہوئے گیتوں اور ملکہ پھراج کی الابی ہوئی غزلوں اور امراضیاء کی اڑائی ہوئی تانوں کی دھیمی سریلے سروں میں نقل اتارتیں۔ میں کئی بار اپنے بالا خانے کی کھڑکیوں کے رنگین شیشوں میں سے انہیں دیکھنے کی کوشش کیا کرتا تھا اور جب ان میں سے مجھے کسی کے چمکنے ہوئے بال یا گورے شانے یا ناچتی پتلی مخروطی انگلیاں، یا گلہابی پاؤں دکھائی دیتے تو میرے دل کے اندھیرے میں اچانک بہت سے جگنو ٹٹمٹمانے لگتے اور یہ ٹٹمٹماہٹ اس وقت تک قائم رہتی جب تک میں اپنے رخسار ٹکا کر ان ٹٹمٹماہٹوں کو زندہ کر لیتا۔ کئی بار جی میں آئی کہ ان میں سے کسی ایک کی توجہ اچانک میری طرف متعطف ہو جائے۔ وہ اپنی دوسری بہنوں کے جھرمٹ سے نکل کر دیوار پر کہنیاں رکھ دے اور ہاتھوں کے پیالے میں اپنے ٹھوڑی جما کر مجھے دیکھے۔ دیکھتی جائے اور مسکراتی جائے اور جب دوسری لڑکیاں نیچے اتر جائیں تو وہ کہیں سے چھتی چھپاتی میرے پاس آجائے اور میرے بازوؤں پر اپنی زلفیں بکھیر کر کہے۔ ”غنفر تم میرے خوابوں کے دیوتا ہو۔ میں چھت پر کشیدہ کاڑھنے نہیں آتی۔ تمہیں دیکھنے آتی ہوں۔ غنفر تم سبز اور نیلے اور گلہابی شیشوں کے پیچھے سے مجھے نہ جھانکا کرو۔ اس مقصد کے لیے سفید شیشے بہت اچھے رہتے ہیں۔ یا اگر تم کھڑکی کھول ہی دیا کرو تو کیا ہرج ہے۔ تہذیب نو کا اگر ہمیں یہ پہلا سبق بھی یاد نہیں تو تف ہے ہم دونوں کی جوانیوں اور تعلیموں پر! — اور غنفر۔ اگر تم برا نہ مانو تو میں ہر رات تمہارے چرنوں میں اپنے

پریم کے پھول ارپن کر جایا کروں کیونکہ تم میری خوابوں کے دیوتا ہو!“ —
یہ سرگوشیاں مجھے اپنے بالا خانے کی چار دیواری میں سرسراتی ہوئی سنائی دیتیں
اور میں سوچنے لگتا کہ ان سب لڑکیوں میں سے وہ کون سی لڑکی ہے جو یوں
چھپ چھپ کر میرے دل میں جگنو سے روشن کرتی رہتی ہے — اور جب
جگنو چنگاریوں میں تبدیل ہونے لگے — جب مجھے ان ٹمٹماہٹوں میں ہلکی
ہلکی تپش کا احساس ہونے لگا تو میں گھبرا سا گیا کیونکہ میری منگنی ہو چکی ہے اور
کہتے ہیں کہ میری ہونے والی بیوی اس قدر خوبصورت ہے کہ اگر میں اسے دیکھ
لوں تو شاعر بن جاؤں!

کھڑکیوں سے ڈر ڈر کر اور سہم سہم کر جھانکنے والے کے شانے سے
اگر کسی پتلی آواز والی دوشیزہ کی انگلی چھو جائے تو نیند کہاں آئے۔ میری نیندیں
اڑ گئیں۔ میری ماندگی دور ہو گئی اور جب پوچھنے میں کوئی ایک گھنٹہ باقی تھا تو
میں باہر نکل آیا۔ زرد چاند دور مغربی افق کے قریب اونگھ رہا تھا اور موٹے
موٹے ستارے سلیٹی آسمان پر ناچ رہے تھے۔ ہوا میں خنکی آگئی تھی اور گاؤں
سے ڈھولک کی دبی دبی تھاپ کی دھن پر لڑکیوں کے تھکے گیتوں کی بھنک کبھی
کبھی میرے کانوں میں پڑ جاتی تھی جن میں سے میں صرف یہ الفاظ سمجھ سکا۔
”ندیاں — جھرنے — چاندنی راتیں — ستارے — محبوب
— آنکھیں — بال — ہونٹ!“

یہ کیسی دنیا ہے! میں نے سوچا۔ یہاں کے شاعروں کے ذہن میں
جھرنوں ستاروں آنکھوں اور بالوں کے سوا اور کوئی موضوع نہیں! کیا یہاں کے
لوگ موت کے نام سے ناواقف ہیں کہ ان کے گیتوں میں جادو دانی کیفیتیں
جھلکتی ہیں — کیا یہاں اس حقیقت سے کوئی باخبر نہیں کہ جھرنے رک جائیں
گے۔ ستارے بجھ جائیں گے۔ آنکھیں مند جائیں گی۔ اور بال جھڑ جائیں گے
— اور پھر اس ناپختہ اور گاتے ہوئے ہجوم سے آنکھ بچا کر اس دھندلے

مکان میں کھسک آنے والی من چلی لڑکی کے دل میں کیا خیال سلایا تھا کہ وہ سنبل
کی دھن میں بے چارے غنفر کی رگوں میں چنگاریاں بھر کر دھوئیں کے مرغولے
کی طرح فضا میں کھو گئی — غنفر جس نے دہلی میں رنگین شیشوں کی آڑ
لے کر کئی ہوائی محل بنائے اور جو ان پتلی آوازوں اور لالبنے بالوں اور جھکی
جھکی آنکھوں والیوں کے ذرا سے مس کے لیے اتنا عرصہ ترستا رہا!

گیتوں کی آوازیں دھیمی پڑتی گئیں۔ اور میرے خیالات دہلی اور اس
صحرا کی نازنینوں کے ہیولوں میں لپٹتے گئے۔ ٹیلوں کی ٹھنڈی ریت میرے جوتوں
میں بھر گئی تھی جس کی وجہ سے میرے جلتے ہوئے تلواروں کو بہت سکون پہنچ رہا
تھا۔ صبح کا ستارہ مشرقی افق پر کسی دلہن کے ماتھے کی طرح چمک رہا تھا اور آس
پاس اکیلی اکیلی بولوں میں نڈے ہیں ہیں چلائے جا رہے تھے۔ کہ اچانک مجھے
اپنے قریب ہی ایک بھرائی ہوئی سرگوشی سنائی دی۔ میں جھٹ ریت پر دو بکا،
گیا۔ کان لگا کر سنا تو آواز آئی۔ ”اسی لیے تو میں بار بار تم سے پوچھ رہا ہوں کہ
تم آج اتنی اداس کیوں ہو! سمن سے باہر ڈراؤنی کھجوروں میں جب ہم چھپ
چھپ کر باتیں کرتے تھے تو تم کتنی بٹاش ہوتی تھیں۔ تمہارے ہونٹوں پر
پٹریاں اور تمہاری آنکھوں میں نمی مجھے اُن دنوں نظر نہ آئی حالانکہ ہر گھڑی
ہمیں اپنے راز کے کھل جانے کا ڈر تھا۔ لیکن اب — یہ سمن کا صحرا اور یہ
حیران چاند — لوگ گاؤں میں ناچ اور گا رہے ہیں اور ہم ادھر ببول کی
اوٹ میں ایک دوسرے کے اتنے قریب — اس قدر قریب بیٹھے ہیں زگرے
تمہارے دل میں آج کیسا کانٹا کھنک رہا ہے۔ تم اتنی چپ چاپ کیوں ہو
زگرے؟“ — اور اس کے بعد مجھے زگرے کی سسکیاں بھری آواز سنائی دی۔
”مجھے یہ موا میدان جیسے نکل لے گا۔ میں تو گھبرا گئی ہوں سنبل — سنبل
میں سمن میں گھبرا گئی ہوں۔ مجھے آج بخار ہو رہا ہے۔“ اور اس کے بعد بہت سی
الجھی ہوئی اور ہراساں سرگوشیاں سرسراتی رہیں اور پھر ببول کی اوٹ سے ایک

سایہ اٹھا اور سنبل کی آواز آئی۔ ”چلو چلیں۔۔۔ یا تم پہلے چلی جاؤ۔ اکیلے گھبراؤ گی یہاں۔“

”نہیں۔“ زرگس نے جواب دیا۔ ”پہلے تم جاؤ۔“ پوچھتے ہی میں گاؤں آ جاؤ گی، اب اگر مجھے رستے میں کوئی مل جائے اور پوچھ بیٹھے کہ میں اس وقت کدھر گئی تھی۔ تو کیا جواب دوں گی میں؟“

اور سنبل بولا۔ ”پھر پوچھنے تک میں یہیں تمہارے پاس کیوں نہ پڑا رہوں۔“

”نہیں نہیں سنبل۔“ دبی دبی اور ملتجیانہ آواز آئی۔ ”تم جاؤ۔ بس۔۔۔ اب تم جاؤ۔“

اور سنبل ہولے ہولے قدم اٹھاتا ٹیلوں کی پرلی طرف غائب ہو گیا۔ صبح کا ستارا بہت اونچا چڑھ آیا تھا اور پورب کے اندھیرے کپکپانے لگے تھے۔ دلی کی کشیدہ کاڑھتی ہوئی لڑکیوں اور یہاں کی صحرائی دوشیزاؤں کے ہولے سمٹنے لگے اور آخر ایک پرچھائیں میں سا گئے جو میرے سامنے بول کی اوٹ میں بیٹھی جانے کدھر دیکھ رہی تھی۔

اچانک ایک خیال میرے دل پر ایک لمبی سی خراش ڈالتا میرے دماغ میں گھومنے لگا جیسے لڑکے تالابوں کی سطح پر پتھر تھرتھراتے ہیں اور وہ طویل سفید لکیریں پیدا کرتے بہت سے دائرے بناتے اور بلبلے چھوڑتے۔ یہ کی طرف ڈوبنے لگتے ہیں!

ایک بہت لمبا سا چکر کاٹ کر میں نے اس بول کا رخ کیا جہاں زرگس پوچھنے کا انتظار کر رہی تھی۔ سٹی بجاتا ہوا میں اس کے قریب سے گزرا۔ وہ بول کے نیچے گھڑی کی طرح گھٹی جا رہی تھی۔ میں یونہی بے پروایانہ انداز میں بول کے قریب سے گزرتے ہوئے ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ ”شی۔ شی“ میں نے تالی بجائی اور پھر دو قدم آگے بڑھ کر میں نے زرگس کے جسم کو چھو لیا۔

”شی!“ میں نے پھر تالی بجائی اور اب زرگس دیوانوں کی طرح بال چٹک کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا سینہ تیز تیز سانس لینے کی وجہ سے ابھرا اور ڈوبا جا رہا تھا اور اس کی لٹیں اڑاڑ کر بول کی سوکھی شاخوں سے لپٹی جا رہی تھیں۔

”کون ہے تو؟“ میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

”ارے!۔۔۔ غنغنا!“ دبی دبی آواز آئی۔

”تم نے مجھے کیسے پہچانا؟“

”تمہارے شکاری لباس سے۔“

”تم کون ہو؟“

”میں۔۔۔ میں۔۔۔ میں ادھر کمن سے برات کے ساتھ آئی ہوں۔ وہاں گاتے ناچتے تھک گئی توجی بھلانے ادھر چلی آئی۔“

”ہاہاہاہ!“ میں ہنسا! میں سمجھا کوئی ہرنی دیکھی بیٹھی ہے۔ شکاری جہاں جائے شکار کا بھوت اس کے سر پر سوار ہوتا ہے۔ شکر ہے میرے پاس اس وقت بندوق نہ تھی ورنہ بڑی مشکل بنتی۔“

وہ خاموش کھڑی رہی۔ اس سے باتیں کرنے کے لیے کئی بہانے تیز جھونکوں کی طرح میرے ذہن پر بہت سی لہریں پیدا کرتے گزر گئے۔ مشرقی افق پر اندھیرے اسی طرح کپکپا رہے تھے اور صبح کا ستارا جیسے میرے جذبات کے بے ہنگم طوفان پر دل ہی دل میں سنک رہا تھا۔ آخر میں بولا۔ ”کو تو تمہیں گاؤں پہنچا دوں۔“

اس نے اڑتی ہوئی لٹوں کو ایک ہاتھ سے اکٹھا کر کے دوپٹے کے پیچھے سرکاتے ہوئے کہا۔ ”میں خود چلی جاؤں گی۔ میں رستہ جانتی ہوں۔“

”رستہ تو تم ضرور جانتی ہو گی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن مجھے سنبل کی فکر ہے۔ تمہاری راہ دیکھ رہا ہو گا۔“

وہ یوں چونک پڑی جیسے ننھے بچے سوتے میں بادل کی گرج سے ڈر کر

گھبرا جاتے ہیں اور حواس باختہ ادھر ادھر دیکھنے لگتے ہیں۔ اس نے چار طرف نظریں دوڑائیں اور پھر مجھے چند لمحے دیوانوں کی طرح گھور کر گردن جھکالی اور مٹھیوں میں ریت بھرنے لگی۔

”میں سب کچھ دیکھ رہا تھا“ — میں نے اس کے کلیجے میں ایک اور سوئی گھونپ دی۔ مجھے کمزوروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے میں بڑی لذت ملتی ہے۔ میں بولا۔ ”میں سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن زگس۔ تم آج اتنی اداس کیوں تھیں۔ سنبل بیچارے کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ جانے اس ریت میں اس بیچارے کے کتنے آنسو جذب ہو چکے ہیں۔ زگس۔ گو میرا کوئی حق نہیں کہ تمہارے ذاتی معاملات میں دخل دوں اور مجھے امید بھی نہیں کہ جو بات تم سنبل کو نہ بتا سکیں وہ میرے سامنے کہہ ڈالو گی، لیکن اگر میں تمہارے کسی کام آسکوں تو میں بخوشی یہاں چند روز ٹھہر جاؤں گا۔ دیکھو نا، سنبل میرا دوست ہے۔ اگرچہ میری اور اس کی دوستی صرف چند گھنٹے قبل شروع ہوئی ہے لیکن میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ تمہیں اس کے خلاف کوئی شکایت پیدا ہو گئی ہو تو مجھے بتا دو۔ میں اسے سیدھی راہ پر لے آؤں گا۔ میں شکاری ہوں اور میرا نشانہ بہت کم چوکتا ہے۔ سنتی ہو؟“

”جی سن رہی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”سنبل سے مجھے کوئی شکایت نہیں۔ سنبل میرا بہت پرانا ساتھی ہے۔ سنبل کے من میں میرے متعلق کبھی میل نہیں آیا۔ سنبل گیت بناتا ہے اور یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ گیت بنانے والوں کو لڑکیاں بہت چاہتی ہیں۔ لیکن وہ ان سب کے حسن سے یوں آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ جیسے وہ سوائے میرے دنیا کی سب کنواریوں کے لیے اندھا ہو چکا ہے۔ لیکن میں — میں نے — مجھے — ”وہ رک گئی اور مٹھیوں میں بھری ہوئی ریت نیچے گرانے لگی۔

”تم نے بات ختم نہیں کی۔“ میں اس کے قریب ہو کر بولا۔

”میں۔“ وہ ہکھلانے لگی۔ ”میں آج بہت اداس ہوں۔ میں برات کے ساتھ نہ ہی آتی تو اچھا تھا۔“

میں نے پوچھا۔ ”لیکن آخر تمہاری یہ اداسی سنبل کے ساتھ بے پروائی سے کیا تعلق رکھتی ہے؟“

اور اچانک ہوا میں اس کا دوپٹہ پھڑپھڑایا اور میرے بازو سے لپٹ گیا اس نے دوپٹہ کھینچنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ادھر میں نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی اور ہم دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے چھو گئے۔ میرے بازو سے اس کا دوپٹہ لپٹا رہ گیا اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے بال ہوا میں اڑنے لگے اور میں نے اس کا دوپٹہ بازو سے اتارتے ہوئے کہا۔ ”لو“ — اور ہمارے ہاتھ پھر چھو گئے۔ لیکن اب کے جو چھوئے تو الگ نہ ہو سکے، جیسے چمٹ کر رہ گئے ہیں — ہم دونوں کی انگلیوں میں کوئی مبہم سی لرزش بھر گئی۔ اور میں نے وہاں بول کی سوکھی ٹہنیوں کی آڑ میں دیکھا کہ افق مشرق پر پوپھوٹ رہی ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں کی چمک، اس کے گلابی گالوں کی غیر محسوس نمی اور اس کے باریک ہونٹوں کی کپکپاہٹ پر نظریں گاڑ دیں اور جب ہماری اکثری ہوئی انگلیاں ڈھیلی ہوئیں اور ہمارے سر پر سے ایک پرندہ سن سے گزر گیا تو میں نے پوچھا۔ ”لیکن تم اداس کیوں ہو زگس؟“

اور وہ میری گھڑی کے شیشے پر انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔ ”آج رات جب سے میں نے آپ کی باتیں سنی ہیں اور پھر آپ کو سنبل کے دھوکے میں جگا بیٹھی ہوں میرے دل میں آپ کا چہرہ بس رہا ہے۔ مجھے ان صحراؤں سے نفرت ہو گئی ہے۔ مجھے آپ سے اور آپ کے وطن سے محبت ہے۔ لیکن آپ پر دہی ہیں۔ آپ آجکل یہاں سے چلے جائیں گے اور میں راتوں کو سمن کی کھجوروں کے جھنڈوں میں بیٹھ کر آپ کی پرچھائیوں سے باتیں کیا کروں گی — آپ کب جائیں گے؟“

”میں کبھی نہیں جاؤں گا۔“ میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔
آٹھ دس کوؤں کا غول ہمارے سر پر سے کانیں کانیں کرتا سوسن کی طرف اڑ گیا۔

اور جب وہ بول کی آڑ سے نکل کر سوسن کو چل دی تو میں نے یوں محسوس کیا جیسے اچانک مجھ پر مسرتوں کے بادل برس پڑے ہیں۔ جیسے خفتہ مقدر کی گردن کٹ کر دور جاگری ہے اور جیسے دنیا جہان کی لڑکیاں اور خاص کر دہلی کے اس بالا خانے کی دو شیرائیں لپک لپک کر میرے قدموں پر سر رکھ دیتی ہیں اور کہتی ہیں ”ہمیں چاہو“۔ اور میں سب کو ٹھکراتے ہوئے کہتا ہوں۔
”زرگس کے پھولوں اور تھوہر کے کانٹوں کا کیا مقابلہ۔ جاؤ۔ یہ شکاری انہیں صحراؤں میں شکار کھیلے گا۔“ جاؤ۔ اور ان لڑکیوں کو ٹھکانے کی دھن میں میں نے کئی بار چلتے چلتے ریت کا ایک طوفان اڑا اڑا دیا!

میں واپس سوسن پہنچا اور جب برات کے جانے کی تیاریاں ہوئے لگیں تو اداس سنبل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئی کہا۔ ”اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟“

میں مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے ساتھ سوسن میں چند روز رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے تم جیسا سادہ مزاج اور پیارا دوست کہیں نہیں ملا اور تمہارے ہمراہ چند لمحے گزار کر مجھے روحانی خوشی ہوگی۔“
سنبل خوش ہو کر بولا۔ ”آپ میری آنکھوں میں رہیں۔ میرا گھر آپ کا گھر ہے۔ آپ شوق سے تشریف لائیے۔“

اور میرا بوڑھا ملازم تنپ کر کہنے لگا۔ ”لیکن میاں جی۔ وہ میری بڑھیا بیچاری کھاٹ پر پڑی ایریاں رگڑ رہی ہوگی۔ میرے بغیر اسے پوچھنے والا ہی کوئی نہیں۔ پھر اس صحرا میں ہرنیاں تو اب کے ملتی نہیں کہ وقت گزر سکے۔“
اور بوڑھا بھوس جھکا کر اور پتلیاں پھیر کر مجھے یوں گھورنے لگا جیسے

کہہ رہا ہے۔ ”بچے تجھ پر بھوت پریت کا اثر ہو گیا ہے۔ تجھ پر اب میرا بس نہیں چل سکتا۔ خدا ہی تجھے واپس لائے تو لائے!“

اور جب برات واپس سوسن کو روانہ ہوئی تو سب نوجوان ساربانوں نے میری طرف اشارے کرتے ہوئے سنبل سے آکر پوچھا۔ ”کیا آپ بھی سوسن جا رہے ہیں؟“۔ ”ہاں“۔ وہ فخریہ انداز میں جواب دیتا اور سب ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے اور کہتے۔ ”بڑی خوشی کی بات ہے!“
اور میں نے اوپر سنبل کے اونٹ پر جھولتے ہوئے کجاوے میں زرگس کو دیکھا جس کا چہرہ تیز دھوپ میں کندن کی طرح دمک رہا تھا اور جس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی جو شاید صبح کے ستارے کی کپکپاہٹوں سے مل کر بنی تھی!

اس روز مجھے معلوم ہوا کہ شاعر بے چارے جھوٹ نہیں لکھا کرتے۔ بالکل سچ کہتے ہیں۔ ان کے خیالات میں غلو کا نقص نکالنے والے ذرا کسی ایسے کجاوے کے سائے میں چل کر دیکھیں جس پر ایک پیکر شباب بیٹھی جھول رہی ہو، تو انہیں اپنے اعتقادات کی قدر عافیت معلوم ہو جائے میں چاہتا تھا کہ اس کجاوے کے ساتھ مرتے دم تک سفر کرتا رہوں اور پھر یوں ہو کہ اونٹ اپنے قافلے سے الگ ہو کر بھٹک جائے۔ بیشمار ٹیلوں کے سنساتے ہوئے بیکراں میدان میں یہ کجاوے والی نیچے اترے اور وہاں ہم چاندنی راتوں اور سیمیں صبحوں کے آغوش میں ایسی میٹھی باتیں کریں جو شاعر لوگ اپنے شعروں میں لکھا کرتے ہیں اور پھر اچانک مجھے سنبل کا خیال آگیا۔ اس اونٹ کے بھٹک جانے سے سنبل بیچارے پر کیا گذر جائے گی! سر پھوڑ لے گا کسی دیوار سے! دیوانہ ہو جائے گا اور تپتی دوپہروں میں دہکتی ریت پر ننگے پاؤں محو تلاش رہے گا اور کسی اداس شام کو، جب۔۔۔ لیکن اچانک مجھے سنبل کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ گا رہا تھا۔

تمہارا چہرہ دن کے چاند کے طرح بے رنگ اور بے

رونق کیوں ہے؟

تمہارے بالوں پر یہ گرد اور تمہاری پلکوں پر یہ نمی کیسی ہے!

تمہاری باتوں میں یہ ناامیدیاں کیسی ہیں؟ تم یہ کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ تم نے

کہیں میری موت کا فرشتہ دیکھ لیا ہے؟

اونٹوں کی گھینٹاں ٹٹائن بجی جا رہی تھیں اور ان کے قدم ریت پر ہلکی سی خش خش کی آواز پیدا کرتے، ٹیلوں کے درمیان ناچتے ہوئے بڑھے جا رہے تھے۔ کجاوے پر ایک بار میں نے زرگس کی طرف دیکھا جو سنبل پر نظریں گاڑے کچھ سوچ رہی تھی اور جونہی اس کی آنکھیں میری آنکھوں سے ملیں تو وہ مسکرا دی اور میں سمجھا جیسے یہ اونٹ اپنے قافلے سے بھٹک گیا ہے!

سمن بہت پیارا گاؤں تھا۔ پچاس ساٹھ گھروندے اور پھر سارے گاؤں کو محیط کئے ہوئے لمبی لمبی کھجوروں کی فصیل! — ان کھجوروں کے آس پاس کھیت تھے اور کھیتوں کی پرلی طرف وہی ریت کا سمندر! — سنبل مجھے اپنے گھر لے گیا۔ رنگین پاؤں والے ایک پتنگ پر کھدر کی نئی چادر بچھائی گئی اور اسے ایک چھپر کے نیچے دھر دیا گیا۔ پھر سنبل اور اس کے گھر والے میرے پاس آکر بیٹھے تو ایسی خلوص بھری باتوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے کہ میرے جی میں آئی میں یہاں سے کھسک کر زرگس کے پاس چلا جاؤں اور اسے کہوں۔

”زرگس۔ میں نے غلطی کی کہ تمہارے سامنے یہاں سے کبھی نہ جانے کا وعدہ کر بیٹھا۔ تم دراصل سنبل کی ہو جو اتنا سادہ اور اتنا مخلص ہے اور میں غاصب نہیں بننا چاہتا۔ میں پڑھا لکھا نوجوان ہوں اور جانتا ہوں کہ کسی کے دل میں بے وجہ سوئی چھوٹنے سے یہی بہتر ہے کہ اپنے دل پر شتر چلا لیا جائے۔“

لیکن اس روز شام ہونے سے چند لمحے پیشتر میں سنبل کے گھر سے نکلا

کہ ذرا کھیتوں میں ٹھل آؤں تو دور کھجوروں کی فصیل کی اوٹ میں مجھے زرگس دکھائی دی۔ میں اس کے قریب سے گزرا تو وہ بولی۔ ”میں کب کی یہاں بیٹھی آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ کسی وقت وہاں سے نکلیں گے۔ یہ میرا گھر ہے اور آج رات وہ سامنے بڑے بڑے ٹیلوں میں گھری ہوئی کھجوروں تلے ملیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟“

اور جب میں زرگس سے رات کو آنے کا وعدہ کر کے اسی بڑے بڑے ٹیلوں میں گھرے ہوئے کھجوروں کے جھنڈ تلے پہنچا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہاں ہر طرف ننھے ننھے فرشتے پر پھر پھڑپھڑاتے باریک گلوں سے تیز تیز سر نکالتے چکر لگا رہے ہیں۔ خادما میں عود و عنبر کی خوشبو میں چھڑک رہی ہیں۔ پھولوں کی سچ بچھی ہے اور بنسریوں اور الغوزوں کی لمبی لمبی تھرتھراتی تانوں میں لپٹا ہوا یہ سنج اپنا آغوش داکئے مجھے اور زرگس کو بھینچ رہا ہے۔

شام کو نہایت پر تکلف کھانا کھا کر میں سنبل اور اس کے بزرگوں کو شہروں کی باتیں سناتا رہا۔ ریڈیو، ٹریموں، بجلی کی روشنیوں اور آپنی آپ پر اٹھ جانے والے لفٹوں کی باتیں سن کر وہ میرے نزدیک کھسکتے آئے۔ ایک میراثی میری پیٹھ دابنے پر مامور ہو گیا۔ حقے کی نے ادھر ادھر تیزی سے پھرتی ہوئی بار بار میرے لبوں کو چھونے لگتی اور بہت دیر تک وہیں رکی رہتی۔ اور سنبل پل پل بھر بعد مجھ سے پوچھ لیتا۔ ”آپ کو نیند تو نہیں آئی؟ آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ آپ گھبرا تو نہیں گئے؟“ — اور یہ کہہ کر وہ چپ چاپ سر جھکا کر بیٹھ جاتا اور جب کہیں ادھر ادھر دیکھتا تو سامنے دیوار پر ایک کیل سے لٹکی ہوئی لائین کی زرد شعاعوں میں مجھے اس کی پلکیں اور رخساروں پر ایک مبہم سی چمک نظر آ جاتی!

جب سب اپنی اپنی کھاؤں پر جانے کے لئے اٹھنے لگے تو میں نے سنبل سے کہا۔ ”میں ذرا باہر کھیتوں میں گھوم گھام آؤں۔ میں دراصل سیر پانے کا

بہت عادی ہوں اور دن بھر کے سفر سے بھی میرا جی سیر نہیں ہوا۔

اور سنبل نے پوچھا۔ ”کیا میں بھی چلوں آپ کے ساتھ؟“

اور میں گھبرا کر بولا۔ ”نہیں نہیں۔ تم نے کونسا گناہ کیا ہے کہ مجھ دیوانے کے ساتھ ٹانگیں تھکاتے پھرو۔ میں ابھی لوٹ آؤں گا۔“

اور جب میں نے کھیتوں کی مینڈھوں پر سے گزر کر کھجوروں کے اس فردوسی جھنڈ کا رخ کیا تو کوئی پرندہ من سے میرے سر پر سے گزرا اور کھجوروں کے جھنڈ کے ساتھ ٹکرا کر پھڑپھڑاتا اندھیرے میں ڈوب گیا!

کھجوروں کے منقش تنوں کے درمیان زرگس میرے انتظار میں تھی۔ بہت دیر تک بیٹھے ہم عجیب و غریب باتیں کرتے رہے۔ میں اسے کہتا۔ ”زرگس یہ تمہارے بال نہیں یہ تو میری تقدیر کا تانا بانا ہے۔“ اور وہ کہتی۔ ”غصنفر (اور یہ نام کہتے ہوئے اس کی زبان کئی بار لڑکھائی) یہ تمہاری آنکھیں نہیں یہ تو مستیوں کے دو چشمے ہیں جنہوں نے مجھے اس قدر چھکا دیا ہے۔“ میں کہتا۔ ”زرگس یہ تمہارے پاؤں ہیں یا کنول کے پھول جن پر شفق کا عکس پڑ رہا ہو۔“ اور وہ کہتی۔ ”غصنفر۔ یہ تمہارے ہاتھ گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں یا کخواب کے۔!“ اور اس کے بعد جب میں نے اسے شہروں کی باتیں سنائیں تو وہ میرے بہت قریب کھسک آئی۔ اپنا سر میرے شانے سے ٹکا دیا۔ اور بہت دیر تک ریڈیو، ٹی وی، بجلی کی روشنیوں اور آبی آپ اٹھ جانے والے لفٹوں کے حالات سن کر دم بخود رہ گئی۔ پھر ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور جب میں سنبل کے مکان کے قریب ایک موڑ مڑا تو اچانک سنبل میرے مقابل آگیا۔ ”بہت دیر لگا دی آپ نے“ اس نے کہا۔

”ہاں بہت دیر ہو گئی۔“ میں نے رکتے رکتے جواب دیا۔ ”دراصل مجھے ریت پر بہت رات گئے تک بیٹھے رہنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ شہروں میں اس قسم کی ریت اور خاموش راتیں اور کھلے میدان نہیں ہوتے نا۔“

تم کہاں پھرتے رہے؟“

اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی ادھر کھجوروں کے اس جھنڈ کے پاس پھرتا رہا۔“

”کس جھنڈ کے پاس؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

اور وہ مشرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”ادھر۔“ اس جھنڈ کے پاس! اور میں نے جی جی میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ہمارا جھنڈ مغرب کی طرف تھا۔

جب تین راتیں کھجوروں کے اس فردوسی جھنڈ کے نیچے دفن ہو چکیں اور چوتھی رات کا آغاز تھا۔ اور جب میں زرگس کے زانوؤں پر سر رکھے اسے اختر شیرانی کی ایک نظم کا مطلب ذہن نشین کرا رہا تھا تو اچانک ایک قد آور سایہ ہمارے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں بھڑک کر اٹھے اور ہمارے سر ٹکرائے گئے۔ میں نے خوفزدہ ہو کر پوچھا ”کون ہے تو؟“

”میں سنبل ہوں۔“ وہ بولا۔ ”اور یہ زرگس اور آپ غصنفر علی خاں ہیں۔“

اور وہ قریب آکر ایک ہاتھ میرے کاندھے پر اور دوسرا زرگس کے کاندھے پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو کوئے نہیں آیا۔ میں آپ سے صرف ایک بات کرنے آیا ہوں۔ آپ جانتے ہیں زرگس نے مجھے شاعر بنایا۔ زرگس نے میری اجاڑ راتیں بوائیں۔ زرگس نے میری زندگی پر خوابوں کی پھواریں برسائیں۔ آپ سب جانتے ہیں کیونکہ آج چوتھی رات ہے، میں تنوں کی اوٹ میں آپ دونوں کی باتیں سنتا رہا ہوں۔ آپ میرے دوست ہیں اور گو یہ آپ کا حق نہ تھا کہ میری محبوبہ ہتھیا لیتے لیکن اب۔۔۔ جب کہ زرگس سنبل سے تھک چکی ہے، میں اپنی یہ امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ میں غیور دہقان ہوں۔ میں چاہتا تو آپ کے

کلیجے سے ایک چھرا پار کر کے آپ کو انہیں ٹیلوں پر پھینک دیتا اور وحشی گدھیں آپ کی بوٹیاں نوچ نوچ کر آپ کے شہر پر جا کر منڈلاتیں۔ لیکن میں شاعر ہوں۔ میں گیت بناتا ہوں اور میں صرف اپنی محبت کی تسکلی بھانے کا قائل نہیں۔ مجھے ہر دل کی دھڑکن کی قدر ہے۔ زگس سے آپ کو محبت ہو گئی ہے تو اس میں آپ کا قصور نہیں۔ میں اگر آپ کی محبت میں دخل دوں تو یہ میرا پاگل پن ہو گا۔ کیونکہ زگس کے دل میں اب میری کوئی جگہ نہیں رہی۔ لیکن اتنا یاد رکھئے کہ آپ پر دیسی ہیں۔ مسافر ہیں آپ۔ زگس کا دل نہ توڑیے گا۔ اگر زگس کا دل آپ کے ہاتھوں ٹوٹا تو یاد رکھیے کہ — لیکن چھوڑیے اس قصے کو۔ میں صرف اپنی زگس کو آپ کے حوالے کرنے آیا تھا۔ میں اپنے دوست اور اپنے مہمان پر ہاتھ اٹھانا گناہ سمجھتا ہوں۔ اس لیے زگس بیٹھ جاؤ یہاں۔ اور غفتر علی خاں کا سر اپنے زانو پر رکھ لو، اور غفتر علی خاں صاحب۔ آپ اسے کسی شاعر کی نظم کا مطلب سمجھا رہے تھے، سمجھائیے۔ اور اب مجھے اجازت دیجئے اور میری اس مداخلت کو برا نہ مانیے کہ جب جلتی ہوئی لکڑیوں پر پانی ڈالا جائے تو ان میں سے جو دھواں اٹھتا ہے، وہ بہت کڑوا ہوتا ہے۔ — اچھا خدا حافظ۔

ہم دونوں دم بخود کھڑے تھے اور سنبل ہولے ہولے چلتا کھجوروں کی فصیل میں غائب ہو گیا تھا۔ کتنی دیر تک ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی۔ اور جب زگس کی سسکیاں بلند ہو گئیں اور میرے دل کی دھڑکن سے کھجور کے تنے بھی لرزے ہوئے معلوم ہوئے تو میں دھم سے ریت پر بیٹھ گیا۔ زگس بھی بے جان لو تھڑے کی طرح گر پڑی — وہ روتی رہی — میں سوچتا رہا — اور جب اس نے روتے روتے اپنا سر میرے شانے سے لگا دیا تو میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”یہ سنبل انسان ہے یا فرشتہ! — اور زگس ہم جاگ رہے ہیں یا خواب دیکھ رہے ہیں؟“ — اور وہ اپنے آنسو

پونچھتے ہوئے بولی۔ ”ہم جاگ رہے ہیں اور یہ سنبل ہی تھا جس نے اپنے محبت کی نقش کو اپنے ہاتھوں کفتایا — لیکن میں کیا کروں غفتر۔ میں مجبور ہوں۔ تم اتنے اچھے، اتنے پیارے ہو — اور مجھے تم سے اور تمہارے شہر سے اتنی محبت ہے! —“

چکا چوند

جلد ہی وہ بادل چھٹ گئے جو سنبل کا سایہ ہم پر پھیلا گیا تھا اور جب میں زگس سے جدا ہو کر سنبل کے مکان کے قریب پہنچا تو سوچنے لگا کہ میں کیا منہ دکھاؤں گا اپنے میزبان کو! جی میں آئی چل دوں یہاں سے، لوٹ جاؤں اپنے شہر کو۔ لیکن ایک ابابیل کھجوروں کے اسی فردوسی جھنڈ سے اڑتی ہوئی آئی اور سن سے میرے سر پر سے گزر گئی — سن سے واپس چلے جانا میرے لیے بہت دشوار تھا — اور جب سنبل نے اتنی بڑی قربانی کی تو اب اس سے جھجک کیسی — جب اس کا من اتنا صاف ہے تو اپنے من پر یہ میل کیا! — اور جب میں اس کے مکان کے دالان میں داخل ہوا تو وہ کھاٹ پر سے اٹھ بیٹھا اور بولا۔ ”آپ آگئے ہیں؟ — آپ نے میری باتیں محسوس تو نہیں کیں؟ آپ میرے بھائی ہیں اور یقین جانئے میں آپ پر خفا نہیں — میں جس امانت کا بوجھ نہ اٹھا سکا وہ آپ کے حوالے کر دی، اور اب آپ کے ہاتھ میں میری امانت کی لاج ہے۔“

میں خاموش بستر پر لیٹ گیا اور دیر تک حیران ہوتا رہا کہ یہ عجیب و غریب دنیا ہے، یہاں ایک دوسرے کی محبت کی اس درجہ قدر کی جاتی ہے اور یہ عجیب نوجوان ہے جس نے اپنے جذبات کا نور اپنے سینے میں چھپا لیا ہے — پھٹک رہا ہے۔ لیکن دم نہیں مارتا!

اور اب یہ سلسلہ شروع ہوا کہ جب رات کو سب لوگ سو جاتے تو وہ

کہتا ”بھائی صاحب — آپ ابھی تک باہر نہیں گئے؟“ میں شرمندہ اور حیران باہر چلا آتا اور جب لوٹتا تو وہ کھاٹ پر سے اٹھتے ہوئے کہتا۔ ”آگئے آپ؟ کسی چیز کی ضرورت ہے؟“

ایک مہینہ گزر گیا۔ ہر رات نرگس کی زلفیں میرے بازوؤں پر پریشان ہو جاتیں۔ اس کے نرم زانوؤں پر سر رکھ کر میں دیر تک کھجوروں کی شاخوں میں الجھے ہوئے ستاروں کو دیکھتا رہتا۔ اب ہم باتیں بہت کم کرتے تھے کیوں کہ ہم وہ سب حسین خیالات ایک دوسرے کے سامنے اگل چکے تھے جو عشق و محبت کے عام قصوں میں استعمال کئے جاتے ہیں اور اب ایک شب ایسی بھی آئی کہ جب میں کھجوروں کے اس جھنڈ کے قریب پہنچا تو مجھے اس کے ارد گرد پھڑپھڑاتے ہوئے چیتھڑوں والے خوفناک بھتنے وحشیانہ ناچ میں مصروف نظر آئے اور کھجوروں کی شاخیں مردوں کے پنجروں کی طرح فضا میں ہولے ہولے جھولتی دکھائی دیں۔ میرے قدموں میں وہ تیزی نہ تھی۔ میری رگوں میں وہ کھولاؤ نہ تھا۔ میں ریٹتا ہوا جھنڈ کے پاس پہنچا۔ نرگس میری منتظر بیٹھی تھی۔ بولی۔ ”تم نے آج اتنی دیر کیوں لگا دی؟ تکتے تکتے میرے آنکھیں پھرا گئیں۔ تم آج تھکے تھکے کیوں ہو اور تمہارے چہرے پر یہ اداسی کیوں ہے؟“ غنفر تم آج کیا سوچ رہے ہو؟“

حقیقت یہ ہے کہ اب میں نرگس سے تھک چکا تھا۔ فطرتِ انسانی سکون کی شیدائی ہونے ہوئے بھی ایک خاص وقت میں سکون سے فرار بھی چاہتی ہے۔ مجھے اب اس کے نرم زانوؤں میں فولاد کی سی سختی محسوس ہونے لگی اور جب اس کے بال میری بانہوں پر لہراتے تو میرے جسم میں ایک پھریری سی دوڑ جاتی جیسی چیونٹیاں ریگ رہی ہیں! یہ عجیب زندگی ہے۔ میں اس روز سوچتا رہا کہ دن بھر اجنبی دہقانوں کے چمکھٹ میں بیٹھ کر فضول گپیں ہانکو اور رات ایک اجنبی لڑکی کی خاطر اس ہولناک صحرا میں ان ڈراؤنی کھجوروں کے

جھنڈ میں گزار دو۔ نہ سینما، نہ ریڈیو، نہ چاندنی چوک اور نہ کنات سرکس، نہ ہاپوں کا مقبرہ اور نہ جامع مسجد کی سیڑھیاں! یہ ایک جیسے ٹیلے — تیز دھوپ اور پھر رات کو ایک ہی لڑکی — روزانہ وہی بال، وہی باہیں، وہی آنکھیں — اور ان سب پر مستزاد یہ کہ وہی باتیں، چچوڑی ہوئی ہڈیاں۔ ہر وقت جان کا خوف اور پھر ایک اداس اور تھکی ہوئی بھیگی آنکھوں والا چپ چاپ میزبان جو نہ پہلے کی طرح گاتا ہے اور نہ قہقہے لگا کر ہنستا ہے — اور یہ دیہاتی چھو کر — یہ مجھ سے محبت نہیں کرتی۔ میرے وطن سے، میری تہذیب کے اس گوارے سے محبت کرتی ہے جہاں اس کے زعم میں غنفر بغیر کسی خوف کے بازار کے عین درمیان کھڑا ہو کر اس کے لب چوم سکتا ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ وہ اکثر کہا کرتی ہے — ”تم مجھے اپنے وطن لے جاؤ گے نا؟ تم مجھے ٹریموں پر سوار کراؤ گے۔ تم مجھے ریڈیو سناؤ گے۔ سینما دکھاؤ گے۔ نئے نئے کپڑے خرید دو گے۔ میرے کانوں میں سونے کے بندے ہوں گے اور باہوں میں ہاتھی دانت کا چوڑا — ہے نا؟“

مجھے ابکائیاں آنے لگیں۔ میں انگڑائیاں لینے لگا۔ میری آنکھیں غنفر سے بوجھل ہو گئیں۔ میں تھک چکا تھا مجھے اپنے ارد گرد ٹھہرے ہوئے پانی کی بوسے آنے لگی۔ اس روز جب نرگس نے میری اداسی کی وجہ پوچھی تو میں بولا۔ ”در اصل نرگس مجھے شکار کا بہت شوق ہے۔ ایک مہینے سے میں نے کوئی نیا شکار نہیں کیا۔ کہو تو کل شکار پر چلا جاؤں! دو چار دنوں کے بعد لوٹ آؤں گا اور پھر تمہیں اپنے دیس لے جاؤں گا۔ جہاں ہر کام بجلی کے زور سے ہوتا ہے۔ عمارتوں پر چڑھنے کے لیے سیڑھیوں کی ضرورت نہیں۔ بٹن دباؤ اور کھٹ سے اوپر — دور جانے کے لیے پیدل چلنے کی ضرورت نہیں۔ موٹر میں بیٹھو اور چھپاک سے وہ جا رہے ہیں — نئے کپڑے خرید کر درزی کی دکان کے چکر کاٹنے کی ضرورت نہیں، سلعے سلائے جہر اور ساڑھیاں خریدو اور پل میں دلہن

بن جاؤ — چلو گی نا؟

لیکن وہ تو موم کی صورت بن کر بیٹھی تھی۔ میں نے شانہ ہلایا تو رونے لگی۔ میں نے جھلا کر کہا۔ ”عجیب بات ہے! میں اب ساری عمر اس جھنڈ تلے کیسے پڑا سڑتا رہوں۔ محبت کے علاوہ انسان کو دوسرے کام بھی ہوتے ہیں۔ میرے ماں باپ ہیں۔ بہن بھائی ہیں۔ میرے قیمتی شکاری کتے ہیں۔ ان کی فکر کرنا بھی مجھ پر فرض ہے۔ شکار بھی کھیلتا ہے اور پھر لوٹ آؤں گا۔“ یہاں سے کبھی نہ جانے کاجو میں نے وعدہ کیا تھا اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ بس یہیں جم کر بیٹھ رہوں گا۔ اری یہی آٹھ دس دن لگیں گے پھر یہی جھنڈ ہو گا اور یہی غصہ ہو گا اور۔۔۔“ لیکن وہ بدستور روتی رہی۔ اس کے چند آنسو میرے ہاتھ پر آگرے۔ اور میری ہتھیلی پر جیسے کسی نے تیزاب چھڑک دیا ہے۔ میں گھبرا کر اٹھا۔ ”اچھا تو زگس“ آج اتوار ہے نا؟ اگلی اتوار کو اسی وقت یہیں موجود رہنا۔ میں ضرور آؤں گا۔ سنی ہو؟“ اچھا۔۔۔ میں اس کے ہاتھ کو تھپکا کر جھنڈ سے باہر نکل آیا۔ لیکن وہ وہیں بیٹھی رہی اور جب بہت دیر کے بعد اٹھی تو نہایت تیزی اور وحشت سے!۔۔۔ قدم یوں اٹھائے جیسے اڑ جائے گی۔ اس کے ہر قدم پر ریت یوں اڑنے لگی جیسے اس روز میں نے زگس سے پہلی ملاقات پر پوچھے اڑائی تھی!

دوسرے روز علی الصباح میں نے سنبل سے شکار کے بہانے سے اجازت مانگی۔ اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی اور وہ لاشعوری طور پر میری انگلیاں دباتے ہوئے بولا۔ ”آپ واپس آئیں گے؟ آپ سیدھے اپنے وطن کا رخ تو نہیں کر لیں گے؟“

”نہیں۔ نہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ بھی کبھی ہو سکتا ہے! بس ہفتہ بھر کے لیے ادھر ادھر گھوم گھام کر واپس آجاؤں گا۔ صحرائی دیہات میں میرے بہت سے شناسا ہیں۔ میں انہیں مل کر جلد لوٹوں گا۔“

میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ تم تو سب کچھ سمجھتے ہو!“

”جی ہاں۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”سب کچھ سمجھتا ہوں اسی لیے تو کہہ رہا تھا کہ جلد لوٹے گا۔“

اور جب میں سن سے نکلا تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا جیسی کوئی تتلی کسی بچے کی مٹھی میں بہت دیر تک قید رہتی ہے اور جب اس زنداں سے نکلتی ہے تو یوں تیز اور سیدھی پرواز کرتی ہے جیسے کائنات کے آخری سرے پر جا کر دم لے گی!

شام کو میں ایک اسٹیشن پر پہنچا۔ دہلی کا ٹکٹ لے کر گاڑی پر سوار ہوا۔ صبح سویرے دہلی جا اترا۔ اپنے بالا خانے پر پہنچا تو کتے میرے قدموں میں لوٹنے لگے۔ میرا بوڑھا ملازم منہ کھولے بھویں لٹکائے مجھے گھورنے لگا۔ ”آپ گھبرائے ہوئے ہیں! آپ ہانپ کیوں رہے ہیں؟ آپ۔۔۔ آپ میں ابھی پیر جما سے کوئی تعویذ گنڈا لاتا ہوں۔ میں نہیں کہتا تھا آپ پر بھوت پریت کا سایہ پڑ گیا ہے!“

میں نے زور سے قہقہہ لگایا اور ہنستا ہوا اوپر بالا خانے پر آیا تو اچانک رنگین شیشوں کی پرلی طرف انکم ٹیکس افسر صاحب کی ایک لڑکی میرے کمرے کی طرف یوں دیکھتی نظر آئی جیسے اس نے یہاں سے کوئی عجیب و غریب آواز سن لی ہے۔ میرے قہقہے رکے تو وہ آنکھیں جھپکانے لگی اور جب میں نے تازہ ہوا کے بہانے سے کھڑکی کھول دی کہ اب مجھے لڑکیوں سے وہ پہلی سی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔۔۔ تو وہ جھٹ دیوار کے پیچھے چھپ گئی۔ لیکن دیوار میں بے شمار رخنے تھے جن میں سے میں نے دیکھا کہ وہ میری طرف دیکھ رہی ہے! جگنو سے چپکنے لگے میرے دل میں!۔۔۔ زندگی تغیرات کا نام ہے اور خشک کھجوروں کی اوٹ میں بیٹھی ہوئی چھوکری سے اینٹوں کی اس دیوار کے پیچھے دہکی ہوئی نیم پوشیدہ لڑکی کتنی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ میں نے کاغذ کے ایک پرزے

پر ”مزاج شریف“ کے الفاظ لکھے اور ایک کنکر پر لپیٹ کر اسے پرلی چھت پر پھینک دیا۔ میں نے کھڑکی بند کر دی کیونکہ اب ملازم کتے باندھ کر میرے جوتے اتارنے آرہا تھا۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھایا تھا کہ اچانک کٹاک سے ایک رنگین شیشہ کرچی ہو کر فرش پر بکھر گیا اور ایک کانڈ میں لپٹا ہوا کنکر میری کنپٹی پر آن گرا۔ ”کون ہے بے وقوف کا بچہ!“ میرا نوکر چنگھاڑتا ہوا کھڑکی کی طرف لپکا ”کون ہے اپنی ماں کا لاڈلا“۔ اور پھر اچانک پاؤں پکڑ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ شیشے کا ایک ٹکڑا اس کے پاؤں میں چبھ گیا تھا۔ بلبلاتا اور پتھر پھینکنے والے کو ہزاروں صلواتیں سناتا وہ سیڑھیاں اتر گیا۔ میں نے کنکر پر سے کانڈ اتارا۔ نسوانی طرز تحریر میں لکھا تھا۔

مزاج پوچھ کے رگ رگ میں بجلیاں بھر دیں
وہ آئے تھے میرے دل کی لگی بجھانے کو

”بانداق معلوم ہوتی ہے!“ میں نے چٹنی کھولتے ہوئے سوچا۔ ہاتھ کے اشارے سے میں نے اسے شعر کی رسید پہنچائی تو کھڑی ہو گئی۔ بہت دیر تک مجھے دیکھتی رہی جیسے کہہ رہی ہے۔ ”میری سب بہنوں کی شادی ہو چکی ہے اور میں یہاں تنہا رہ گئی ہوں۔ میرا یہاں اکیلے جی نہیں لگتا۔ مجھے ایک ساتھی کی تلاش تھی اور حیران تھی۔ کہ تم اتنے دنوں سے ان رنگین شیشوں میں سے نہیں جھانکے۔ میں تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔ شکر ہے تم آگئے۔ شکر ہے۔ شکر ہے!“ اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو چپکنے لگے اور آنچل سے اپنا چہرہ چھپاتی پرے چلی گئی۔ دیوار کے رخنے سے میں نے اس کی اونچی ایڑی کی گرگاہی دیکھی اور میں سمجھا جیسے وہ اونچی ٹیلی ایڑی میری پسلیوں کو چٹکاتی میرے دل میں دھنسی جا رہی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کنکر پھینکنے کا سلسلہ دو چار روز جاری رہا اور اگلی اتوار کی ایک دھندلی چاندنی رات کو میرا بالا خانہ لونڈر کی خوشبو سے

لبریز ہو گیا۔ اونچی ایڑی والی گرگاہی جب میرے کمرے کے فرش پر پڑی تو میرے دل میں بے شمار شمعیں سی جھللا اٹھیں۔ سنہرے بال بازوؤں پر بکھر گئے اور سمجھوتوں کے آبی سائے سرمراتے ہوئے خشک بالوں، پٹریاں جے ہونٹوں اور فولادی زانوؤں والی ایک چھوکری کو ساتھ لئے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے نکلے جانے کا ہر گم ہو گئے۔

دوستوں کی محفلوں میں میرے قہقہے بلند ہو گئے اور میرے سب احباب حیران ہونے لگے کہ لڑکیوں سے کترانے والا جنسی تعلقات کا موضوع چھیڑنے پر آنکھیں بند کر کے کارل مارکس کے اقوال گنگانے والا خشک غنفر اب ساقی سیمیں اور عارض گلگوں اور کاکل عنبر فشاں اور تبسم شرر بار کی باتیں کرنے میں سب سے بڑھ چڑھ کر کیوں حصہ لیتا ہے اور یہ کیا وجہ ہے کہ اسے جوش کے سارے ”نقش و نگار“ اختر کی ساری سلمائی نظمیں اور حافظ کے سارے خمریات ازبر ہو گئے ہیں۔ جی ہاں۔۔۔ وہ بے چارے یہ نہ سمجھ سکے کہ مرغابیوں اور ہرنیوں کا شکاری اب کجاوے میں جھولتی ہوئی اور بھونڈے زیوروں سے لدی پھندی لڑکیوں اور اونچی ایڑی کی گرگاہیوں اور لونڈر میں بسی ہوئی زلفوں والی مسوں کا شکار کھیلتا ہے۔

میرا بوڑھا شکاری ملازم روزانہ دس بار مجھے سے کہتا۔ ”آپ شکار پر کب جائیں گے؟ اب بڑھیا تو مر چکی جس کی مجھے فکر رہتی تھی۔ اب میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ کتے بھی تیار ہیں اور آج کل شکار بھی عام ملتا ہے۔“ اور میں مسکرا کر کہتا۔ ”کتے بیچ دو اور شکار کا ذکر چھوڑ دو۔ سامنے کھڑکی کے شیشے صاف کرو۔ اب میں شکار پر نہیں جاؤں گا۔ میں آج کل بہت مصروف ہوں۔“

اور پھر اچانک اس شکاری کے سر پر ایک بادل زہرہ گداز کڑک پیدا کرتا ہوا ابھرا اور ایسی ڈالہ باری ہوئی کہ کھیت دھنکے گئے، نالے چڑھ آئے اور

گیا۔ میں بے دم ہو کر ایک جگہ گر گیا کہ اچانک تند جھونکوں کی پر خوف چیخوں میں مجھے ایک گیت سنائی دیا۔

آندھیو! اور زور سے چلو اور کائنات کو جڑوں سے اکھیڑ کر
فضا میں لڑھکا دو۔

طوفانوں! چیختے ہوئے آؤ اور کھجوروں کے جھنڈ اپنے شانوں
پر رکھ کر افق پر غائب ہو جاؤ۔

گھٹاؤ! ژالہ باری کرو۔ اور سمن اور سوسن کی چراگاہیں
دھنک کر رکھ دو کیونکہ اے آندھیو! طوفانوں اور گھٹاؤ!

اس دنیا نے محبت کو ایک وقتی کھیل سمجھ لیا ہے!

میں نے آواز پہچان لی۔ ”سنبل۔ سنبل۔“ میں پکارتا ہوا گرجتے
ہوئے طوفان میں ادھر ادھر دوڑنے لگا۔

اور پھر سامنے ایک اونٹ کا سایہ ابھرا۔ لپک کر میں اس کے قریب
پہنچا اور چیخا۔ ”سنبل۔ سنبل۔“

”آئیے غنفر علی خاں صاحب۔ کئے خیریت تو ہے۔“

”میں تمہیں ملنے آیا ہوں۔“ میں نے اس سے لپٹتے ہوئے کہا۔ وہ بے

جان بت کی طرح کھڑا رہا اور پھر بولا۔ ”شوق سے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔“

”تم کہاں سے آرہے ہو؟“

”سمن سے۔“

”مجھے زگرس سے بھی ملتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ملیئے۔“ وہ اونٹ کی مہار کو اپنے انگلی کے ارد گرد لپیٹتے ہوئے بولا

”لیکن دیکھئے۔ وہ مصروف ہو گی۔ سورج غروب ہونے سے سورج

طلوع ہونے تک وہ قریب قریب دس نوجوانوں سے ملاقات کر لیتی ہے۔ ہم نے

اسے ایک کھلونا سمجھ کر پھینکا اور وہ ساری دنیا کے لیے کھلونا بن گئی۔ سنبل اور

پگھلے ٹیاں مٹ گئیں!!

دھندلکے

میرا شکار خلاف معمول دو تین روز میرے پاس نہ آیا اور میں ساری
رات بالا خانے کی کھڑکیوں اور سیڑھیوں کو دیکھ دیکھ کر ترستا رہا اور جب ایک
شام کو میں ہمایوں کے مقبرے پر میر کو گیا تو ایک کنج میں مجھے ایک بچہ پر وہ ایک
نوجوان کے زانوں پر سر رکھے لیٹی نظر آئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”کون کتا کہ
اپنے مگیتر سے شادی سے پہلے ملنا خلاف تہذیب ہے۔ لیکن تم اپنے دوستوں
میں یہ باتیں نہ کرنا کہ پرسوں مگنی ہوئی اور کل سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو
گیا۔ وہ کہیں گے۔ میں کوئی آوارہ چھو کری ہوں!“

”پگلی!“ ہنستے ہوئے نوجوان نے جواب دیا۔

اور اچانک کھجوروں کے سائے سرسراتے ہوئے لہراتے ہوئے
بالوں، نارنجی ہونٹوں اور گداز زانوؤں والی ایک دو شیرہ کو ساتھ لئے کہیں سے
آئے اور میرے دماغ کے ارد گرد قیامت خیز تیزی سے گھومنے لگے۔

لڑکھاتا ہوا میں وہیں سے دہلی اسٹیشن پر پہنچا۔ صبح سویرے اسی ننھے
اسٹیشن پر جا اترا اور پھر سمن کا رخ کر لیا۔

تیز دھوپ کی وجہ سے نیلے تپ رہے تھے اور ہر طرف ایک بھاپ سی
اٹھ رہی تھی۔ دکھتی ہوئی ریت میرے جوتوں میں بھر گئی لیکن میں حیران و
ششدر، پریشان و پشیمان چلتا گیا۔ چلتا گیا۔ اور جب سورج مغربی
ٹیلوں کی اوٹ میں غروب ہو گیا تو اچانک پورب کی طرف سے ایک آندھی
اٹھی اور آن کی آن میں چار طرف چھا گئی۔ میری آنکھوں میں ریت بھر گئی۔
میرا لباس پھڑپھڑانے لگا۔ میرے قدم اکڑ اکڑ گئے۔ بولیں شوکنے لگیں اور اُن
دیکھے ہاتھ لپک لپک کر میرے گلے کو اس زور سے دبانے لگے کہ میرا دم گھٹ

غفتر آج کل اس کے خوابوں کے بھوت ہیں! جائیے۔ — خدا حافظ۔“

اس نے مہار ڈھیلی کی اور آن کی آن میں بڑھتے ہوئے اندھیرے میں سایہ بن گیا۔ ہر طرف بھتنے سے ناچنے لگے اور جب میں اپنے پتے ہوئے دماغ کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر پچکھاڑتے ہوئے اندھیرے میں ایک طرف منہ اٹھا کر چل دیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل میں چپکتے ہوئے جگنوؤں کو اچانک کسی نے مٹھی میں دبا کر مسل ڈالا ہے!

کشتیاں

سارے علاقہ پر مدت سے ایک بوند تک نہ پڑی تھی۔ لے دے کے ”کرسی نشین صاحب“ کا ایک کنواں تھا، وہاں پہرہ بٹھا دیا گیا کہ کوئی پانی نہ کھینچے۔ منہ اندھیرے لوگ سروں پر مگائیں لادے گاؤں سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر جاتے جہاں جھیل کے کڑوے اور کھارے پانی سے اپنی پیاس بجھاتے واپس آنے تک ان کے گلے جھل جاتے، لیکن بھوکا خاک چاٹ کر بھی جی سکتا ہے، پیاسا آنسو پی کر بھی زندہ رہ سکتا ہے، یہ تو جھیل کا پانی تھا۔

سارا دن گاؤں سے جھیل تک آنے جانے والوں کا تاننا بندھا رہتا۔ مرل اونٹ جو اپنی کمزوری کی وجہ سے چلتے پھرتے بھوت معلوم ہوتے تھے، صبح کو گاؤں سے پیٹھ پر گھڑے لادے نکلتے اور چراغ جلے واپس آتے۔ سانپ بچھو کے خوف سے بے پروا ہو کر اب راتوں کو بھی لوگوں کا یہی مشغلہ تھا۔ بیکار انسان اگر اپنے ہاتھوں اپنا گلا کاٹتا رہے تو بھی اسے یہ تشفی تو رہتی ہے کہ وہ کوئی کام کر رہا ہے۔ راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ دن کا چین خواب و خیال ہو گیا۔ گلیوں میں خاک اڑنے لگی۔ چوپال پر کرسی نشین صاحب کا سرحدی حقہ دھوپ میں سوکھ کر بے رنگ ہو گیا۔ مسجد کے صحن میں مولوی جی نے ”نیاز بو“ کے جو چند پودے لگائے تھے زرد تنکے بن کراڑ گئے۔ ہونٹوں پر پٹیریاں جم گئیں۔ آنکھوں میں دیرانی جھلکنے لگی۔ ابھری ہوئی مچھلیاں اور تنے ہوئے پٹھے سکر کر بیجان رگوں میں تبدیل ہو گئے۔ نہ کبڈی کے میلے لگتے نہ کشتیاں ہوتیں

اور نہ مل چلاتے وقت بیلوں کے مقابلے کی نوبت آتی۔ کوئی اکٹھا کام کرتے تو میراثی کو دھول بجانے کا موقع ملتا، اب وہ بیچارہ بھی کھاٹ پر بیٹھا پرانے دھولوں اور بوسیدہ شہنائیوں پر تیل ملتا رہتا کہ ان کے ظاہری حسن میں تو کمی نہ آئے۔ دو دو تین تین کی ٹولیاں بکر لوگ گلیوں میں دیواروں کا سارا لئے بیٹھے رہتے زور زور سے کھانتے۔ پوری قوت سے خاک پر تھوکتے اور پھنتے ہوئے بے رونق ہونٹ آستینوں سے پونچھ کر اوپر بھورے آسمان کی طرف دیکھتے۔ تپے ہوئے تانبے کی طرح آسمان کی وسعتیں لرزتی رہتیں اور زمین کے سینے سے بے پناہ پیاس کی وجہ سے ہر طرف دھواں سا اٹھتا معلوم ہوتا۔

ان کی گفت گو بھی کچھ اس قسم کی ہوتی،

”ارے کوئی نئی بات سنا۔“

”نئی بات؟ — آج جانوں کا گدھا بھری ہوئی گاگریں اٹھائے آ رہا تھا کہ اچانک بیٹھ گیا۔ گاگریں ٹوٹ گئیں اور جانوں میاں وہیں زور زور سے ہنسنے لگے۔ کتنے لگے۔“ گدھے تیرا قصور نہیں۔“ پاس ہی مولوی جی سر پر گھڑا اٹھائے ریٹکتے آ رہے تھے، پلٹ کر بولے۔ ”تو پھر کس کا ہے؟“ جانوں بولا۔

”خدا کا۔“

مولوی جی لال پیلے ہو گئے، مسجد میں آ کر فتویٰ دے دیا کہ ”جانوں کافر ہے، خدا کو نہیں مانتا۔ اس کا حقہ پانی بند کر دیا جائے۔“ ہم سب ان کے پاؤں پڑے کہ حقہ پانی ملتا ہی کہاں ہے کہ بند کر دیا جائے، اور پھر انسان اپنے آقا سے شکایت کر ہی بیٹھتا ہے، پھر محتاط رہے گا۔ خدا خدا کر کے معافی تو جانوں کو مل گئی مگر ڈر گیا ہے بیچارہ۔ سنا ہے مسجد میں ابھی تک نماز پڑھ رہا ہے۔ کتا ہے قرآن شریف ختم کر کے اٹھوں گا یہاں سے اور بارش ہونے پر مسجد کا ٹوٹا ہوا مینار مرمت کراؤں گا۔ بے جا بوجھے ایسا جرم کر بیٹھا۔“

پرلی گلی سے دو چار ادھیڑ عمر بزرگ ریٹکتے ہوئے آئے اور وہاں بیٹھ

گئے۔ ”کوئی نئی بات سناؤ۔“

”اے نئی بات کیا ہونی ہے۔“ ایک ادھیڑ عمر بزرگ بھووں اور پلوں سے دھول پونچھتے ہوئے بولا۔ ”اللہ یار بیچارہ دم توڑ رہا ہے۔ حکیم جی کہتے ہیں گیہوں کی گھٹکنیاں کھائے تو شاید حالت پلٹ جائے، لیکن گاؤں بھر میں آج کل باجرہ اور جوار ہی پک رہے ہیں۔ گیہوں کہاں سے آئیں کہ نسخہ تیار ہو۔ کچھ عجیب سا جواب ملا۔ بولے۔ ”جا کر کہیں مزدوری کر لے، مجھے تیرے دادا کا قرضہ تو نہیں دینا۔“

ایک نوجوان جھکی ہوئی دیوار کا سارا لیکر اٹھا۔ ”بچی بات کسی ملک نے۔ اے پھلے آ، شہروں میں نکل چلیں۔“

پہلے خاک پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ بولا۔ ”رہنے بھی دے حیات۔ وہاں پہلے سے ہی مزدوروں کی فوج موجود ہے۔ کون پوچھے گا ہمیں۔ ہر پیسے والا مفلس کو مزدوری کی تلقین کرتا ہے، کرسی نشین صاحب نے کوئی نئی بات نہیں کی!“

بارش کا موضوع اب ان کے لئے بہت فرسودہ ہو گیا تھا۔ کوئی بھولے سے یہ ذکر کر بیٹھتا تو سب لوگ منہ نوچ لیتے اور کہتے ”اب بادل نہیں اٹھنے کے، اب بارش نہیں ہونے کی، ساون کا نام بدل دینا چاہیے!“

کچھ دنوں کے بعد علاقے میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ ضلع میانوالی کے دو ڈاکو ہندو قین لئے علاقے میں آ گئے ہیں اور لوٹ مار کر رہے ہیں۔ سارا مجمع ہنس پڑا۔

”بھئی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا۔ خالی ہٹکے اٹھا کر لے جائیں تو ان کی مرضی ورنہ ان کے پیٹ بھرنے کے لئے تو ہمارے پاس اس میدہ ایسی مہین دھول کے سوا اور کچھ نہیں!“

حیات اور پھلے نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مجمع سے کھسک

کر ایک تنگ گلی میں آگئے۔

حیات بولا۔ ”بھئی میرا خیال ہے ہم بھی کسی گھاٹی میں چھپ بیٹھیں۔ کوئی کھاتا پیتا گزرے تو دبوچ لیں اسے۔ آخر ہمارا بھی کوئی حق ہے نا۔ مانگنے پر نہیں دیتے نہ سسی، کوئی سبیل تو چاہیے نا آخر۔“

پھلا بولا۔ ”رہنے بھی دے حیات، کیا گندی تجویز سوچی تو نے، کسی کا پیٹ چاک کر کے اپنا پیٹ بھر لینا، اس سے تو بہتر ہے کہ انسان طاعون سے مری ہوئی چوبیا کھالے۔“

حیات گھبرا گیا۔ ”تھوہ! متلا گئی میری طبیعت۔ لیکن یہ کرسی نشین لوگ بھی تو ہمارا پیٹ چاک کر کے۔“

”کوئی سن لے تو تھانے بھیج دے۔“

مرل مرل قدم اٹھاتے دونوں پھر مجمع میں واپس آگئے۔ وہاں ایک بوڑھے نے ایک تجویز پیش کر رکھی تھی کہ صاحب کے پاس سارے کا سارا گاؤں چلا جائے اور ہاتھ جوڑ کر پکارے کہ ان داتا۔ ہماری بھی کچھ فکر کر۔ ہم تیری پر جا ہیں۔ ہم پیٹ پر پتھر باندھے تھک گئے ہیں۔ انتڑیاں رسیاں بن گئی ہیں۔ بیٹھ جائیں تو اٹھا نہیں جاتا۔ سانس لینا بھی عذاب ہے۔ میں نے سنا ہے کہ صاحب ضلع ویسی ہے، ویسی بھائی ہماری فریاد سمجھے گا شاید ترس کھا کر کوئی علاج کر ڈالے ہماری مصیبتوں کا۔“

حیات آگے بڑھ کر بولا۔ ”ہاں، ہاں سنا ہے“ اس کے پاس دس ہزار کی ایک موٹر ہے۔ ہو سکتا ہے ترس کھا کر ہمارے لئے موٹر بیچ ڈالے اور رقم ہم میں تقسیم کر دے۔ آخر پیدل چلنا کوئی گناہ تو نہیں اور وہ یہ سب باتیں سمجھتا ہو گا۔“

پھلا اسے کھینچتے ہوئے بولا۔ ”لے بیٹھ بھی جا۔ کیا بھولی باتیں کرتا ہے۔ صاحب تیرے لئے موٹر بیچ ڈالے گا؟ کیا خواب دیکھ رہا ہے تو! قسم خدا کی

ہماری وضع قطع کے لوگ اس کے سامنے جائیں تو کتے چھوڑ دے ہمارے پیچھے چہرہ اسی ہمیں دھن ڈالیں، پولیس ہمیں دبوچ لے۔ ہو سکتا ہے ہم سب حوالات میں ٹھونس دیئے جائیں۔“

”وہاں روٹی تو ملے گی نا۔“ حیات بولا۔ ”اس گھر سے حوالات بھلی۔“

پھلا چٹکی سے کان میں سے میل نکالتے ہوئے بولا۔ ”اور ہمارے پیچھے ہماری بو بیٹیاں، مائیں بہنیں بے شک تڑپ تڑپ کر مرجائیں۔“

مجمع دم بخود رہ گیا۔ جہاں بو بیٹیوں کی آن پر حرف آنے کا خوف ہو، وہاں یہ کنگلے تھی شکم لوگ کٹ نہ مریں؟ بوڑھوں کے ہونٹ لرزنے لگے۔ جوانوں کی چھاتیاں ابھرنے لگیں۔ بچے آنکھیں جھپکانے لگے۔ سب پھلے کو حیران نگاہوں سے گھورنے لگے! ایک بوڑھا لاٹھی کے سہارے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”ختم بھی کرو یہ باتیں۔ کہاں کی بات تھی، کہاں آکر رکی۔ میرا دماغ گھوم رہا ہے!“

مجمع منتشر ہو گیا۔ حیات اور پھلا اسی طرح گردنیں لٹکائے پاؤں گھسیٹتے تنگ اور ہرتی پھرتی گلیوں میں ہوتے ہوئے اپنے اپنے گھروں میں آگرے۔

بھوک کی شدت سے لوگ مرنے لگے تو کسی پڑھے لکھے نے اخباروں میں دو سطریں چھپوا دیں۔ تب جا کر سرکار کو معلوم ہوا کہ چالیس پچاس ہزار کی آبادی میں الو بول رہا ہے۔ تجویز ہوئی کہ علاقے کے بڑے قصبے سے خان کوٹ تک ایک سڑک بنائی جائے۔ اور اس کے لئے ان بھوکے دہقانوں کو پانچ آنے روزانہ پر مزدور رکھا جائے!

سارا علاقہ بڑے قصبے پر ٹوٹ پڑا۔ حیات اور پھلا بھی مزدوروں میں شامل ہو گئے۔ دو دن میں سڑک تیار ہو گئی۔ ایک خاص حصے سے کنکر اٹھا کر پرے پھینکے تھے۔ پلک جھپکنے میں صفائی کر دی گئی۔ مزدوریاں لینے کا وقت آیا تو

سب کو اٹھنی اٹھنی ملی۔

حیات ہمت کر کے پکار اٹھا۔ ”اے بابو جی ہمیں دس آنے ملنے چاہئیں۔“

سارا مجمع چلا اٹھا۔ ”ہاں ہاں۔ ہمارا حق دس آنے ہے۔“
پھلے نے حیات کو ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔ ”اے چپ رہو حوالات بھیج دیئے جاؤ گے۔“

”مگر ہماری دونی کیا ہوئی؟“

”اے چپ رہ بھائی۔ بابو جی بھی تو نگرانی کے دام لیں گے۔“

”مگر کیا تنخواہ نہیں پاتا؟“ حیات نے پوچھا۔

”پاتا ہے مگر تھوڑی ہوتی ہے نا تنخواہ۔ اوپر کی آمدنی آئے تو ان کا کام

چلے!“

”کتنی ہوگی اس کی تنخواہ؟“

”چالیس روپے!“

”چالیس روپے؟ خدا کی قسم مجھے سینے میں چالیس روپے ملیں تو سال

کے بعد پنڈی جا کر موٹر خرید لوں۔“

مجمع منتشر ہو رہا تھا۔ حیات اور پھلا قصبے میں ایک غریب دوست کے

گھر سے اپنی گودیاں اٹھانے گئے۔ رستے میں انہیں ایک بہت بڑا اڑدھام نظر

آیا۔ ایک اونچی جگہ پر کرسیوں میں بڑے بڑے طروں والے لوگ بیٹھے تھے پی

رہے تھے۔ نیچے خاک پر غریب کسان بیٹھے کھائیں رہے تھے اور ایک نورانی

داڑھی والے مولوی صاحب باہیں پھیلا پھیلا کر زور زور سے چلا رہے تھے!

حیات بولا۔ ”ہماری بری حالت دیکھ کر کوئی تعویذ کر رہی ہے

سرکار۔“

پھلا بولا۔ ”اے سن تو سنی۔ ہماری بھوک کی کے خبر۔ یہ تو اپنے پیٹ

بھرنے کے دھندے ہیں۔“

مولوی جی کی آواز آ رہی تھی۔ ”آزادی ہماری آخری منزل ہے۔

آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے، ہم آزاد ہو کر رہیں گے، ہم اپنے گھروں میں

غیروں کے دست نگر نہیں ہو سکتے۔ غلامی کے عفریت کی بوٹیاں چبا ڈالیں گے

ہم۔ ہم محکومی کے دیو کی ہڈیاں پیس دیں گے۔ ہم آزاد ہیں۔ ہم آزاد ہیں،

ہم بولو۔ انقلاب۔“

سوکھی ہوئی پسلیاں پھیلیں اور زخمی گلوں سے مری مری آوازیں بلند

ہوئیں۔

”زندہ باد۔“

بڑی بڑی پگڑیوں اور لمبے لمبے طروں والے آہستہ آہستہ کھٹنے لگے۔

جب وہ حیات اور پھلے کے قریب سے گزرے تو دونوں نے غور سے ان کی

باتیں سنیں۔

”سرکار کا دشمن ہے۔“

”باغی ہے باغی۔“

”بڑا دھوکا ہوا۔“

”میں سمجھا تھا کوئی قصہ سنائے گا۔“

”خفیہ پولیس والے رپورٹ نہ کر دیں ہماری۔“

”میں نے تو کل ہی نمبرداری کی درخواست دی تھی۔“

”بڑے صاحب نے یہ بات سن لی کہ میں بھی اس جلسہ میں شریک تھا

تو میری دعوت کیسے قبول کریں گے۔“

”ملک محمد زماں اور چودھری فتح دین ابھی بیٹھے ہیں؟“

”نہیں، آ رہے ہیں ہمارے پیچھے۔“

”کھسک چلو۔“

حیات کا دماغ گھومنے لگا۔ سوچا۔ یہ کیا غضب ہوا! ایسی کیا بات کہ دی مولوی جی نے کہ بھنا گئے بڑے آدمی!

واپس آتے ہوئے حیات نے پھلے سے کہا۔ ”پھلے بھیا۔ سچ کہوں۔ مولوی جی کی باتوں نے موہ لیا مجھے۔ بڑا رس تھا ان کے بولوں میں۔ میں اب گلی گلی انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاؤں گا۔“

”مگر میں ان کا مطلب نہیں سمجھا۔ آخر کیا چاہتے تھے مولوی جی۔“

”بھئی سمجھا تو میں بھی نہیں۔ یونہی ان کی بات دل کو گلی۔ مطلب تو میں بھی نہیں سمجھا۔“

سر پر گودڑیاں۔ پگڑی کے ایک سرے پر انٹنی بندھی ہوئی۔ سوکھے جھریاں پڑے چرے۔ ریٹکتے ہوئے گاؤں کے نزدیک پہنچے تو انہیں کرسی نشین صاحب کے مکان کے سامنے گلی کے سرے پر بہت سے آدمی کھڑے نظر آئے۔ تیز تیز قدم اٹھانے لگے کہ کہیں فساد تو نہیں ہو گیا۔

انہیں آتا دیکھ کر دو چوکیدار اور کرسی نشین صاحب آگے بڑھے۔ ایک چوکیدار بولا۔ ”اے حیات۔ اے پھلے۔ کمالائے ہو کچھ؟ کیا تم نے کچھ نہیں سنا؟ کل ہمارے گاؤں کی حالت دیکھنے کے لیے صاحب ضلع تشریف لائے ہیں۔ ان کی آمد کی خوشی میں ہم ایک بڑا آرائشی دروازہ کھڑا کرنا چاہتے ہیں جس پر بہت کام کیا جائے گا۔ یہاں سے کرسی نشین صاحب کی چوپال تک جھنڈیاں لٹکائی جائیں گی۔ ہر گھر سے رقم اکٹھی ہو رہی ہے۔ انٹنی انٹنی تم بھی لاؤ۔“

حیات دم بخود ہو کر بولا۔ ”دو دن پھر ڈھوٹے ڈھوٹے ہماری کمریں ٹوٹ گئیں اور خون پینہ ایک کر کے جو پھل ملا اسے تمہارے قدموں میں دھروں؟ یہ کہاں کی شرافت ہے؟“

کرسی نشین صاحب گرج اٹھے۔ ”ارے نکال انٹنی ورنہ دس نمبر میں

چالان کرادوں گا۔ بہت باتیں نہ بنا۔“

پھلے نے حیات کو ٹھوکا دیا۔ ”کھول دے بھئی۔ یہ بچھو جھنک دے۔ ہمیں پیسہ راس نہیں۔“

پھلے ہاتھ پگڑیوں کے کنارے کی طرف بڑھے اور دو انٹنیاں کھنکتی ہوئی کرسی نشین کے زیریں جوتوں کے پاس آگئیں۔

”ان کے سنہرے کاغذ لئے جائیں۔“ کرسی نشین صاحب بولے۔ ”اور اے حیات۔ تم دونوں اپنے بستر اس چٹان پر رکھ دو اور ذرا یہ دو شہتیر گاڑ دو۔ دروازہ کھڑا ہو جائے تو دو سرا کام شروع ہو گا۔“



نوجوان :- تو اس میں خوف کی کوئی بات ہے۔ کیا تم ہر روز سینکڑوں جانداروں کی آنکھوں کو چمکتے اور زبانوں کو ہلکتے نہیں دیکھتیں؟ — لیکن تم ہو کون؟

چرواہی :- میں ادھر ایک گاؤں کی رہنے والی ہوں۔ ابا نے جنگل کے داروغہ سے اس چراگاہ میں بھیڑیں بکریاں اور گائے بیل چرانے کی اجازت لے لی ہے۔ آج میں پہلی بار یہاں آئی ہوں لیکن یہ چراگاہ تو بہت سوئی ہے!

نوجوان :- واہ! یہ نرم نرم سبزہ۔ یہ ہرے ہرے گنجان نیم۔ وہ اودے پرست۔ وہ پرست کے قدموں میں نیلی جھیل۔ یہ جوہڑ۔ یہ جوہڑ کے کنارے پر بوڑھا شیشم اور پھر یہ نیم کے چھتاروں کے سائے — اری یہ جگہ سوئی ہے! (ہنستا ہے)

چرواہی :- لیکن ہمارے گاؤں کی چراگاہیں تو اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔ وہاں ننھے ننھے جھرنے ہیں۔ آئینہ نہ ملے تو ان میں چہرہ دیکھ لو اور پھر ان جھرنوں کے کنارے رنگ رنگ کے پھولوں کی قطاریں — وہاں سب چرواہوں اور چرواہیوں کے پاس بنسریاں ہوتی ہیں اور وہ سب اتنا اچھا گاتی ہیں جیسے بہت سی شہنائیاں اکٹھی بج رہی ہوں۔

نوجوان :- اور یہاں!

چرواہی :- یہاں تو میں جدھر جاتی ہوں۔ چرواہے پڑے سو رہے ہیں اور چرواہیاں بیروں پر پتھر برسارہی ہیں۔ ادھر ایک ہیر زمین پر گرا ادھر سب کی سب ستم گتھا۔ کسی کی اوڑھنی پھٹ گئی تو کسی کی بالی گر گئی۔ اس کے بندے پچک گئے تو اس کی نتھنی ناک کو چیرتی دور جا گری — اور پھر بوڑھے شیشموں کے نیچے کالے کالے اتے اتے سانپ —!

نوجوان :- تمہاری بانہوں جتنے موٹے! (زیر لب مسکرتا ہے)

چرواہی :- تم مذاق کرتے ہو — اللہ قسم میں نے اتنا بڑا سانپ دیکھا ہے

فقیر سائیں کی کرامات

افسانہ گو :- کل کی بات ہے کہ تارہ گاؤں کی جنوبی چراگاہوں کے ایک اندھیرے کنج میں ایک نوجوان چرواہا نیم کے چھتاروں کے سائے میں سو رہا تھا کہ اچانک — دور ایک لڑکی زور زور سے چیختی اور بھاگتی ہوئی آتی ہے اور نوجوان چرواہے کے قریب آگرتی ہے۔ ادھر ادھر بیٹھی ہوئی بھیڑیں بکریاں تترہتر ہو جاتی ہیں۔ چرواہا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے اور خواب آلودہ آواز میں کہتا ہے

نوجوان :- کیا ہے؟ کون ہو تم؟ اتنا چیخ کیوں رہی ہو؟

چرواہی :- (خوفزدہ آواز میں) سانپ۔ سانپ!

نوجوان :- (گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہے) کہاں ہے سانپ؟ کدھر ہے؟

چرواہی :- (انگلی اٹھا کر)۔ وہاں۔ وہ جوہڑ کے کنارے بوڑھے شیشم کی جڑ میں۔ اتنا بڑا۔ میرے بازو جتنا موٹا۔

نوجوان :- شیشم کی جڑ میں؟ (ہنستا ہے) اری بھولی۔ تم شاید ادھر پہلی بار آئی ہو۔ شیشم کی جڑ والے سانپ نے آج تک کسی کو نہیں ڈسا۔ اس کا رنگ کالا ہے نا؟ اور کالے سانپ ڈسا نہیں کرتے — کالے سانپ فقیر ہوتے ہیں — اللہ والے۔

چرواہی :- لیکن اس کی آنکھیں چنگاریوں کی طرح چمک رہی تھیں — اس نے اپنی زبان ہلائی تھی مجھے دیکھ کر!

نوجوان :- اور میں کب کہتا ہوں کہ نہیں دیکھا۔ دیکھا ہو گا۔ اتنا موٹا ہو گا۔ اتنا ہی بھرا بھرا۔ اور ملائم۔ اور۔ اور زہری!

چرواہی :- (کڑک کر) بد معاش لپا! (اٹھ کر جانے لگتی ہے)

نوجوان :- جاتی ہو؟۔ لیکن وہ دیکھو ابھی تک شیشم کے نیچے کوئی چیز ریک رہی ہے۔ کچھ نہیں نظر آ رہا تمہیں؟ کیا خشک پتوں کو چٹختے نہیں سن سکتی؟ فقیر سائیں شاید ادھر ہی کا رخ کر رہے ہیں!

چرواہی :- (پھر وہیں بیٹھ جاتی ہے) اب۔۔۔ اب میں واپس کیسے جاؤں گی!

نوجوان :- ٹھہرو۔ میں بنری بجاتا ہوں، فقیر سائیں وہیں مست ہو کر جھومنے لگیں گے۔

چرواہی :- تمہارے پاس بنری ہے؟

نوجوان :- ہاں۔ (بنری نکالتا ہے) اور میں گاتا بھی ہوں۔

چرواہی :- (سرت آمیز تعجب سے) تم گاتے بھی ہو؟

نوجوان :- ہاں۔ ایسا اچھا گاتا ہوں کہ تم سن لو تو اپنے گاؤں جانے کا نام نہ لو۔

چرواہی :- تو بڑا منہ پھٹ ہے رے!

نوجوان :- لیکن یہ تو تمہارے ہی سوال کا جواب تھا۔

چرواہی :- میں جاتی ہوں۔ اس موئے سانپ کی طرح تیری آنکھیں بھی چمکنے لگی ہیں (اٹھ کر) اب کدھر گیا سانپ!

نوجوان :- وہ کالی کالی لراتی لکیر نظر نہیں آ رہی تمہیں۔ وہ شیشم کے تنے سے کچھ ادھر ہٹ کر۔ وہ جھاڑی کے پاس!

چرواہی :- مجھے تو کچھ نہیں دکھتا۔

نوجوان :- خوف نے تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ (بنری سے ایک سرلی اور تیز آواز نکال کر رک جاتا ہے)

چرواہی :- (شوق بھری آواز سے) بجاؤ۔

نوجوان :- لیکن تم بیٹھتی کیوں نہیں!۔۔۔ اس۔۔۔ ادھر نہیں۔ ادھر۔ یہاں میری چادر پر۔۔۔ چچ چچ جوتے اتارنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اطلس اور کھواب کا فرش تو نہیں۔ یہ تو ایک غریب چرواہے کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

چرواہی :- بجاؤ!

نوجوان بنری بجاتا ہے اور اس سے ایسے ریلے اور سہانے سر نکالتا ہے کہ چرواہی جھومنے لگتی ہے اور جب وہ بنری سبزے پر دھرتا ہے تو چرواہی نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی ہے اور کہتی ہے۔

چرواہی :- بہت اچھی بجاتے ہو۔ بنری کے سارے انگ تمہاری انگلیوں کی پوروں کے بس میں ہیں!

نوجوان :- اور میری انگلیاں خدا جانے کس دھن کے تال پر ناچتی رہیں۔۔۔ میں اپنی بنری سے ایسے سر پہلے کبھی نہیں نکال سکا۔ آج تو مجھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ حد نظر تک پھیلی ہوئی چراگاہیں بنری کی الاپوں میں لپٹی ہوئی میرے ارد گرد چکر لگا رہی ہیں اور میں۔۔۔

چرواہی :- (دبی دبی ہنسی کے ساتھ) ہے ہے۔ میں تو بھونچال سے بہت ڈرتی ہوں اور تو نے ساری چراگاہوں کو گھما دیا۔

نوجوان :- بات کانٹے میں تمہیں خاص دسترس حاصل ہے۔ ذرا آگے بھی تو سن لیا ہوتا۔

چرواہی :- کیا۔ آگے کیا؟

نوجوان :- اور میں نے یوں محسوس کیا جیسے۔۔۔!

چرواہی :- جیسے؟

نوجوان :- جیسے۔۔۔ جیسے۔ (اور پھر کہیں دور دیکھتے ہوئے نہایت تیزی سے بولنے لگتا ہے) جیسے تم ان الاپوں کے سحر سے اٹھ کھڑی ہوئی ہو۔ تمہاری زلفیں ہوا میں اڑ رہی ہیں۔ تمہاری اوڑھنی پھڑپھڑا رہی ہے۔ تمہاری

کالی آنکھیں بھیگ رہی ہیں۔ تمہارے نارنجی ہونٹ کپکپا رہے ہیں اور گھومتی ہوئی چراگاہوں کے پس منظر میں تم آسمانوں پر رہنے والی ایک حور معلوم ہوتی ہو۔ اور اب کہ ہنسی کا سحر ختم ہو چکا ہے، تم اپنے پر پھڑپھڑاؤ گی اور آنکھ کی جھپکی میں آسمان کی نیلاہٹوں میں گھل جاؤ گی، تم۔

چرواہی :- بس۔ دیکھ رہے چھوکرے۔ میں سانپ سے ڈر کر ادھر آئی تھی اور تیرا فرض تھا کہ تو مجھے میرے مویشیوں تک پہنچا آتا اور پھر یہاں آ کر اسی طرح مزے سے سو جاتا۔ یہ جو تو ہیرا، نجھا اور سوہنی مینوال کے قصوں والی باتیں لے بیٹھا ہے، یہ مجھے بہت بری لگ رہی ہیں اور کان کھول کر سن لے کہ میں ایسے زبان درازوں کی گردنیں ناپنے میں بھی تاک ہوں جو مجھے گڑیا سمجھ کر مجھ سے کھیلتا چاہیں۔ سن رہا ہے تو؟ ارے تو نے مجھے ہنسی کے دو چار میٹھے سرسنا دیئے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تو نے مجھے خرید لیا اور اب وارث شاہ کی لکھی ہوئی باتیں دہرانے کا تجھے پورا حق حاصل ہو گیا! بھولے اس راہ پر سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے ورنہ کوئی ہیرا سوہنی کبھی تیرے تالو پر جوتے چٹا کر چلتی بنے گی۔

نوجوان :- قیامت تک یہ نوبت نہیں آ سکتی کیونکہ تم پہلی اور آخری لڑکی ہو جس کے قدموں پر میں نے اپنے نئے نچھاور کئے ہیں۔

چرواہی :- اور شاید میں ہی پہلی لڑکی ہوں جو اپنی جان کے خوف سے تمہارے اس قدر قریب آگئی اور تمہاری پتلیوں میں چنگاریاں چکے لگیں۔

نوجوان :- اوہ۔۔۔ یہاں روزانہ سینکڑوں لڑکیاں لنڈوری چڑیوں کی طرح ادھر ادھر گھومتی رہتی ہیں۔ سب میری ہنسی کی تلوں کو سراہتی ہیں۔

سب میرے اس قدر قریب آ جاتی ہیں کہ ان کے بال میری باہوں کو اور ان کی سانس میری کنپٹیوں کو چھونے لگتی ہیں۔ لیکن پگلی۔۔۔ نئے پیدا کرنے والے کلند کی ناؤ نہیں ہوتے کہ جدھر سے کوئی لہرائے ادھر ہی بہ نکلیں گے۔ یہ تو

فولادی چٹانیں ہوتی ہیں۔

چرواہی :- لیکن یہ فولادی چٹان اپنی جگہ سے اکھڑکیوں رہی ہے؟

نوجوان :- یہی تو بات ہے۔ اور تمہارے سوال کا جواب خود تمہارے پاس ہے۔

چرواہی :- لیکن اگر مجھے اپنے سوال کا جواب معلوم ہوتا تو میں سوال کرتی ہی کیوں؟

نوجوان :- (مسکرا کر) کیونکہ یہ بھی تم خوبصورت آنکھوں والیوں کی ایک مختلطیسی اداس ہے!

چرواہی :- دیکھ رہے۔ اتنا کھل کر باتیں نہ کر۔ لگام دے اپنی کترنی کو، میں کوئی آوارہ لڑکی تھوڑی ہوں کہ تیری ان چکنی چڑی باتوں سے پھسل پڑوں۔ میری منگنی ہو چکی ہے!

نوجوان :- اور یہی حال میرا ہے۔ میں بھی تو کسی اجنبی لڑکی کا منگیترا ہوں۔ ابا کہتے ہیں وہ خوبصورت ہے اور دودھ بلوتے ہوئے ایسے ایسے اچھے گیت گاتی ہے کہ گاؤں کی لڑکیاں اس کے گانے سننے کیلئے چھپ چھپ کر چھتوں پر چڑھ آتی ہیں اور دیر تک سمٹی پڑی رہتی ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ کسی لڑکی کو دیکھے بغیر بیاہ کر لینا پرلے درجے کی نادانی ہے، ہو سکتا ہے وہ کوئی چڑیل ہو۔ اکھڑ اور پھوڑ۔۔۔ ہو سکتا ہے اسکی آنکھیں صرف سرے کی دھار سے خوبصورت لگتی ہوں اور اسکے ہونٹ صرف رنگ سے گلابی بنائے گئے ہوں اور وہ صبح کو اٹھے تو میرے سارے خوابوں پر بھٹنے ناچنے لگیں۔ تمہارا کیا خیال ہے ایسی منگنی کے متعلق؟

چرواہی :- ایسی باتیں لڑکیوں سے پوچھی جاتی ہیں؟۔۔۔ گیت بنانے والے پاگل ہوتے ہیں۔ میں تو راتوں کو بستر پر پڑی روتی رہتی ہوں کہ ابا نے مجھے چوڑی ہوئی ہڈی کی طرح اٹھا کر پرے کیوں بیخ ڈالا۔ جانے وہ کون ہے۔ کیسا

ہے۔ اگر وہ کوئی بڑی بڑی موٹھوں والا آنوسی رنگ کا ہٹا کٹا بھینسا نکل آیا تو اللہ قسم میں تو بیس کہیں چٹان پر سے کود پڑوں گی، اس موئے بھوت کے چنگل میں عمر بھر پھنسے رہنے سے تو یہی بہتر ہے کہ میری نعش نیچے درختوں پر اٹک جائے اور چیلیں اور گدھ میری بوٹیاں نوچ نوچ کر۔۔۔ (اسکی آواز بھرا جاتی ہے نوجوان اس کے ہاتھ کو ہولے ہولے تھپکاتا ہے)

نوجوان :- تم تو رو دیں۔ تم لڑکیاں بھی عجیب ہوتی ہو، من کو ذرا سی ٹھیس لگی اور نین چھلک پڑے۔ قسمت پر بھروسہ رکھو۔۔۔ اور دیکھو۔ تم اب اس طرف پھر بھی کبھی آؤ گی؟

چرواہی :- (اچانک ہاتھ کھینچ لیتی ہے اور آنسو پونچھتی ہے) دو مہینے تک مویشی ادھر ہی لانے پڑیں گے۔

نوجوان :- اور کبھی نیوں کے اس چھتارے کا بھی رخ کرو گی؟

چرواہی :- اگر سانپوں نے راستہ نہ روکا۔

نوجوان :- کالے سانپوں کے سوا مجھے کوئی اور سانپ نظر آ جائے تو اللہ قسم کے سر پر ایزی رکھ کر ایک بار گھومتا ہوں اور سب کچھ چر کر کے دھردیتا ہوں۔ لیکن کالے سانپوں سے خوف کیا۔ یہ تو فقیر ہوتے ہیں۔ کسی نے چھیڑا تو پل پڑے ورنہ کہیں دیکھے بیٹھے رہے۔ نہ کسی سے دشمنی نہ دوستی۔ بس اللہ سے لو لگائے کنڈل مارے پھنکارتے رہتے ہیں۔ ایک دن مجھ سے ابا نے کہا تھا کہ نورے۔۔۔ اگر کہیں کالا سانپ۔۔۔

چرواہی :- کیا نام ہے تمہارا؟

نوجوان :- نور۔۔۔ نور محمد۔

چرواہی :- (گھٹنوں کے بل بیٹھ کر) اور تمہارے ابا کا نام؟

نوجوان :- (حیران آواز میں) بہادر۔۔۔ بہادر خاں۔

چرواہی :- اوہ!

چرواہی گھبرا کر اٹھتی ہے اور جوتے تھینتی بوڑھے شیشم کی طرف بھاگنے لگتی ہے۔ نوجوان ایک دو لمحے حیرت زدہ کھڑا رہتا ہے اور پھر پکارتا ہے۔

(چرواہی رک جاتی ہے اور سر جھکا لیتی ہے)

نوجوان :- اری تم اتنی گھبرا کیوں گئی ہو۔ لو یہ بدماش لپا تمہیں تمہارے مویشیوں تک پہنچا آئے (دو قدم اٹھا کر رک جاتا ہے اور آنکھیں جھپکاتے ہوئے پوچھتا ہے) لیکن تمہارا کیا نام ہے؟

چرواہی :- میرا۔۔۔ میرا۔۔۔ میرے ابا کا نام اللہ دین ہے!

(چرواہا ٹھٹھک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر قہقہے لگاتا ہوا سبزے پر لوٹ جاتا ہے اور آہستہ آہستہ کہتا ہے)

نوجوان :- ابا کہتے ہیں ہونے والی بیویوں کو بیاہ سے پہلے دیکھنے والے نوجوان دوزخ میں جھونکے جاتے ہیں! ہا ہا ہا ہا۔۔۔ کیسی الٹی بات!۔۔۔ ہا ہا ہا ہا!!

☆

انگڑائیاں لیتی اور چاند مسکرانے لگتا!
 ننھا، جسے اسکول میں زبردستی ”بھرتی“ کر لیا گیا تھا، کہتا: ”میں تعریف
 اس خدا کی“ گاؤں تو حیراں رہ جاؤ تم دونوں۔ پر میں کیا کروں۔ مجھے گھڑا بجانا
 نہیں آتا۔“

عمران کہتی۔ ”لے تو گا۔ میں گھڑا بجاتی ہوں۔“

شاہ محمد شریر لہجے میں جواب دیتا۔ ”میں گاگر کے ساتھ نہیں گا سکتا۔“
 بوڑھا اپنے حقے کو گھما کر دیوار سے لگاتے ہوئے کہتا۔ ”تو بڑا بیہودہ
 ہے شاہو، تجھے ضرور گانا پڑے گا۔ لے گا۔ ورنہ باہر اونچی گھر سے نیچے دھکیل
 دوں گا۔“ اور بوڑھا پھٹی پھٹی آواز میں ”روں روں“ شروع کر دیتا۔
 شاہ محمد تھوک نکل کر خدا کی حمد گاتا اور جب اس کے گال شہ دانہ کی طرح لال
 ہو جاتے، گلے کی رگیں ابھر کر پھڑکنے لگتیں اور صاف آنکھوں میں پانی بھر آتا تو
 عمران کہتی۔ ”جانے کیا گایا تو نے۔ خاک بھی پلے نہیں پڑا۔ کیسے اول جلول
 بول تھے اس کے۔ ابا، اسے مدرسے سے اٹھالو۔“

شاہ محمد بھی آنکھیں جھپکا کر کہتا۔ ”ہاں ہاں اچھے ابا۔ نئے منشی جی نے
 مجھے کل ماں کی گالی دی تھی!“

بڑھیا تڑپ اٹھتی۔ ”موا پھانسی پر لٹکے عینک ٹوٹے اس کی۔ اور شاہو۔
 تو نے گالی سن لی اور چپکا بیٹھا رہا۔ زبان نہ کھینچ لی گدی سے؟ انگارہ نہ دھردیا
 زبان پر؟“

ننھا گھبرا کر کہتا۔ ”پر مدرسے میں انگارہ کہاں سے لاتا میں؟“

”انگارہ کہاں سے!“ بڑھیا مرجھائی ہوئی انگلیوں میں نسوار کی ڈبیا گھما
 کر بڑبڑاتی۔ سب ہنسنے لگتے اور بوڑھا کھانسی کو بہت مشکل سے روک کر کہتا۔
 ”نہیں نہیں۔ میرا ننھا پڑھے گا اور جب ”منڈل“ پاس کر لے گا تو ہمیں پٹواری
 بن جائے گا۔“

گونج

شہروں اور دیہات سے دور وہ ایک پرست کی چوٹی پر اپنے ماں باپ
 اور ننھے بھائی کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے ماں باپ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ
 گاؤں میں کاتا تھا، لیکن جب ان کا شباب ڈھل گیا اور انہیں گاؤں سے اتنی دور
 کھیتوں کی دیکھ بھال کے لئے آنا جانا دشوار محسوس ہونے لگا تو وہ گاؤں سے اٹھ
 کر اس چوٹی پر آ گئے جس کے قریب ہی ایک تنگ سی پتھریلی وادی میں ان کے
 کھیت تھے۔ پتھروں کے دو گھروندے کھڑے کر کے انہیں سفید مٹی سے لپ پوت
 دیا اور ایک طرف گائے بکری کے لئے خار دار جھاڑیوں کی نیم دائرہ بناتی ہوئی
 باڑ کھڑی کر دی۔ سات آٹھ دن کے بعد بوڑھا اپنی بھاری بھر کم لٹھ ٹیکتا ہرتی
 پھرتی پگڈنڈیوں پر سے اتر کر نیچے گاؤں جاتا اور صابن، گڑ، نمک، مرچ، تیل اور
 گاہے ماہے اپنی بیٹی عمران کے لئے ولایتی کپڑا خریدتا۔ عمران یہ کپڑا خود سیتی اور
 جب پہن کر ایک میلا سا آئینہ دیکھتی تو کہتی۔ ”ماں یہ کپڑا کتنا شریر ہے۔ چین
 ہی نہیں آتا اسے۔ تڑپے جا رہا ہے!“ اور ننھا شاہ محمد منہ بسور کر کہتا۔
 ”ہم بھی عید پر ایسا ہی کپڑا خریدیں گے؟“

دن بھر چھاج پھٹکے جاتے۔ کنکروں بھرا صاف کیا جاتا۔ بھدے
 چولے میں پتلی سوکھی شاخوں سے دھزدھڑ آگ جلائی جاتی اور رات کو ماں بیٹی
 مل کر خدا کی حمد اور رسول کی نعت گاتیں۔ گاگر بھتی۔ تالیاں ایک خاص تال
 پر پیٹی جاتیں اور جب آوازیں بلند ہوتیں تو اندھیری پہاڑیاں گونج اٹھتیں۔ ہوا

یہ سن کر شاہ محمد اچھل پڑتا۔ کان پر قلم رکھ کر لمبے لمبے قدم اٹھا کر چلتا اور کہتا۔ ”پانچ روپے لاؤ تو یہ زمین تمہارے نام لکھ دوں!“

قلموں سے پرست کی یہ بلندی گونج اٹھتی۔ اور پھر مجرد عمراں گھر اٹھاتی۔ چوٹی کے اتر میں چنانوں سے گھرے ہوئے ایک چشمے کی طرف روانہ ہو جاتی۔ ٹھنڈا صاف پانی گول مول سنگریزوں پر تھرک رہا ہوتا اور آس پاس نرم نرم بھیگی ہوئی گھاس لہرا رہی ہوتی۔ قریب ہی درختوں پر چڑیاں چرچراتیں اور بہت نیچے گاؤں پر گہری کر کا پردہ دھیرے دھیرے اٹھنے لگتا۔ وہ چشمے میں منہ ہاتھ دھوتی۔ گھر کو اندر باہر سے رگڑتی اور اسے بھر کر جب اوپر چوٹی کی طرف جاتی تو چھلکتا ہوا پانی اس کا دوپٹہ بھگو ڈالتا۔ اس کا چولا کئی جگہ پر اس کے جسم سے چپک سا جاتا اور کئی بار جب سامنے سے تیز ٹھنڈی ہوا چلتی اور اس کا لباس پیچھے کی طرف اڑاڑ کر پھڑپھڑانے لگتا تو اپنے اعضا کے قوسی خطوط کو واضح ہوتے دیکھ کر وہ گھبرا جاتی۔ کئی بار دوپٹے کو سینے پر پھیلانے کی کوشش میں گھر توڑ بیٹھتی۔ وہ جانتی تھی کہ آس پاس کوئی دیکھنے والا موجود نہیں لیکن وہ ان دنوں خود اپنے آپ سے شرماتی تھی اور اکثر سوچا کرتی تھی کہ اسے گھر سے باہر قدم تک نہیں دھرنا چاہیے۔ لیکن اس کے ماں باپ بہت بوڑھے تھے۔ بھائی بہت چھوٹا تھا اور پھر یہ تیز گستاخ ہوائیں بھی تو ہر روز نہیں چلتی تھیں۔

کبھی کبھی باپ اسے کھیتوں کی رکھوالی کے لئے بھیج دیتا۔ وہ دیر تک سفید اور سرخ چنانوں پر بیٹھی رہتی۔ کئی بار خدا کی حمد گنگنانے لگتی۔ مٹی بار آسمان کو گھورتی رہتی اور جب اس کے ہاتھ میں کوئی تنکا آ جاتا تو اس کے اتنے ذرا اسے ٹکڑے کرتی کہ انہیں دیکھ کر وہ خود حیران رہ جاتی تھی۔ کھیتوں کی پتھریلی مینڈوں پر چلتے ہوئے اسے بڑی عجیب عجیب سوچیں آتیں۔ پہاڑی پھول توڑ کر بالوں میں سجاتی۔ جھروں میں پاؤں لٹکائے بیٹھی رہتی۔ اور جب شام پڑے گھر کی راہ لیتی تو کوئی احساس اسے مجبور کرتا کہ وہ ہمیں کھیتوں کے کنارے

پڑی رہے۔ اکیلی۔ چپ چاپ۔ پر اسرار آسمان کو گھورتی
رہے اور پھر انہی صاف چٹانوں پر سو جائے۔ صبح ہو اور پھر یہی سلسلہ شروع
ہو جائے۔ لیکن کئی مرتبہ اسے کھیٹوں کی طراوت بخش وسعتوں میں ایک کمی سی
محسوس ہوتی اور جب اس کے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا تو وقت سے پہلے گھر
چلی جاتی۔ اور پھر جب گاگر بھتی اور خدا کی حمد اور رسول کی نعمتیں گونجتیں۔
جب شاہو عجیب عجیب شکلیں بنا کر منشی جی کے تازہ کارنامے سناتا۔ جب بوڑھا
حقہ گڑا کر پیروں فقیروں کے قصے کہتا تو عمراں کے دل پر سے بوجھ اتر جاتے۔
وہ اپنے آپ کو بیحد ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتی۔

لیکن جب اس کا بھائی مدرسے چلا جاتا، ماں کھیتوں کی رکھوالی کرتی اور باپ سودا خریدنے کے لئے گاؤں کا رخ کرتا تو وہ دیر تک بہت نیچے گاؤں کے آخری سرے پر مدرسے کو دیکھتی جو وہاں سے کھلونا سا لگتا تھا۔ اور جب لڑکوں کو چھٹی ہوتی اور ننھے ننھے دھبے ادھر ادھر ریٹگنے لگتے تو وہ اس جھرمٹ میں سے ایک ننھے سے دھبے کو اپنی طرف آتا دیکھتی۔ یہ دھبہ لمحہ بہ لمحہ واضح ہوتا جاتا اور جب شاہو تختی اور بستے کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے اپنے سر پر جمائے ہانپتا ہوا اس کے پاس آکر کہتا۔ ”اللہ کرے آگ لگ جائے مدرسے میں!“

— تو عمراں اسے گلے سے لگا لیتی۔ اسے چومتی۔ اس کے گدگدیاں کرتی۔ اور جب وہ انہی سے لوٹ پوٹ ہو کر ناپنے اور لڑھکنے لگتا تو عمراں کی نس نس دھڑکنے لگتی۔ اور وہ چاہتی کہ نیچے اندھیری گھاؤں اور دور دھند میں ڈوبے ہوئے پریتوں پر تھرکتی اور گاتی پھرے لیکن وہ تھانہ ہو بلکہ اس کے ساتھ کوئی باتیں کرنے والا بھی ہو جس کے گدگدیاں کرنے میں اسے کوئی جھجک نہ ہو اور وہ اسے چشموں میں دھکیل دے، بلندیوں سے لڑھکا دے، اٹھا کر درختوں کی آخر پھسنگوں پر بٹھا دے۔ اس پر بہ بیتیاں کسے۔ اس کا مذاق اڑائے۔ اور پھر گھٹائیں گھر آئیں۔ اونچی نگردوں پر اور تنگ کھاڑیوں میں

ہوائیں فریادیں کریں۔ بجلی کی ٹانگیں آسمانوں پر تڑپ تڑپ جائیں۔ ایک ایک بوند پاؤ پاؤ بھر کی ہو۔ اور وہ سب سے اونچی چوٹی پر سینہ تانے کھڑی ہو جائے اور اپنے ساتھی سے کہے ”اللہ! یہ بارش کبھی نہ تھے!“ — لباسوں کی پھڑپھڑاہٹوں میں اس کا ساتھی کہے ”ہاں یہ بارش کبھی نہ تھے۔ برستی۔ برستی۔ برستی۔ یہاں تک کہ آبادیوں پر سمندر چڑھ آئیں اور پریت کی صرف یہی چوٹی ان سمندروں میں ابھری کھڑی رہے — یہی چوٹی جس پر ہم دونوں کھڑے ہیں!“

دن گزرتے گئے اور عمرائے کی سوچیں زیادہ شدید اور زیادہ گہری ہوتی گئیں اور آخر وہ دن بھی آپہنچا جب اسے رات کو حمد اور نعت گانے سے چڑی ہو گئی۔ وہ اپنی کھاٹ پر لیٹ جاتی اور چہرے کو چادر میں چھپا لیتی۔ ماں باپ اسے مجبور کرتے۔ ”اری عمرائے تجھے کیا ہو گا ہے۔ رسولؐ کی نعت نہیں گاتی؟ رسولؐ کی نعت نہیں گاتی کبھت؟ وہی نعت سنا ذرا۔

مدینے دی بدلی! میرے اجڑے فصلاں تے رحمت دی بونداں وسانے دا وقت اے، عمرائے کی ماں اسے اکسانے کے لیے مگر بجا کر یہ نعت گاتی۔ لیکن عمرائے کروٹیں بدلتی۔ انگڑائیاں لیتی اور خواب آلود آواز میں کہتی۔ ”آج دیر ہو گئی ہے کل گائیں گے!“ — اور پھر کل بھی اسی طرح گزر جاتا۔

اور خدا جانے کیا بات ہوئی کہ جس روز سے عمرائے نے نعت گانا بند کی، آسمان پر بادل کا ایک ذرا سا ٹکڑا بھی نظر نہ آیا۔ کیت زرد پڑ گئے۔ چٹانوں پر بھی خاک اڑنے لگی۔ درختوں، بھیانک ٹنڈنکل آئے اور پھر ایسا دن بھی آیا کہ گاؤں کا تالاب خشک ہو گیا اور لوگوں نے مجبور ہو کر اس چشمے کا رخ کیا جہاں سے عمرائے پانی بھرا کرتی تھی۔ عمرائے کو اس کے ماں باپ نے کئی بار کوسا کہ اللہ میاں اس کی ضد سے ناراض ہو گئے ہیں اس لئے بارش نہیں برساتے، ورنہ اس سے قبل ہفتے میں کم از کم دو بار ندی نالے بہ نکلتے تھے، مگر

عمرائے نے ایک نہ مانی اور بولی۔ ”اللہ میاں اگر صرف مجھ سے ناراض ہیں تو صرف میرے کھیتوں پر ہی بارش نہ برسائیں۔ ساری دنیا کو کیوں ترسا رہے ہیں!“

اور بوڑھا گرج کر کہتا۔ ”یہ قوف۔ تو نہیں جانتی کہ ایک مچھلی سارے جل کو گندا کر دیتی ہے۔ جانے کن سوچوں میں ڈوبی رہتی ہے ہر وقت۔ چند دنوں میں یہ چشمہ بھی سوکھ جائے گا۔ پھر پتہ چلے گا تجھے کہ خدا کا نام لینے میں کیا حکمت ہے یہ قوف چھو کری!“

نشا شاہ محمد کئی مرتبہ اپنی بہن کے قریب آ بیٹھا اور ہولے سے کہتا۔ ”عمرائے دیکھ۔ تو بڑی وہ ہے نعت نہیں گاتی؟ رسولؐ کا نام نہیں لیتی؟ لے اب گا، ورنہ گل لال کر دوں گا طمانچوں سے!“ — اور وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے، آنکھیں پھاڑے ہاتھ تان کر کہتا۔ ”گا!“

عمرائے نہایت مدھم آواز میں بے معنی سے بول گنگنائی۔ لیکن بارش نہ ہونی تھی نہ ہوتی۔

گاؤں سے چشمے تک براہ راست کوئی پگڈنڈی نہیں جاتی تھی اس لئے سب لوگ عمرائے کے آنگن کے قریب سے گزر کر چشمے پر جاتے اور جب پلٹتے تو ان کے ہاں سستانے بوڑھا گاؤں سے بہت سا تمباکو خرید لایا۔ لوگوں کو کھانوں پر بٹھاتا۔ حقہ پلاتا۔ عمرائے اور شاہ محمد انہیں پنکھا جھلٹے اور جب گاؤں والے اٹھتے تو راستے میں کہتے ”بھئی یہ تو بڑے اللہ والے نکلے! انہیں گاؤں سے اتنی دور آباد ہو تا دیکھ کر ہم سب نے انہیں پاگل سمجھا، مگر ان کے دل کتنے صاف ہیں۔ ان کے بولوں میں کتنا رس ہے۔ سب کے سب کتنی خدمت کرتے ہیں ہماری! تمباکو۔ کھائیں پنکھے! اس گئے گزرے زمانے میں بھی ایسے لوگ بستے ہیں اور پھر بھی بارش نہیں ہوتی!“

دن بھر لوگوں کا تانتا بندھا رہتا اور رات کو دم گھونٹ دینے والا جس

پھیل جاتا۔ آسمان پر ستارے برص کے داغ بن جاتے۔ خاموش اندھیروں میں وحشی سنسنائیں اور لوگ پھٹے ہوئے ہونٹوں پر خشک زبانیں پھیر کر کروٹیں بدلتے۔ جمائیاں لیتے، اور صبح کو گدھوں، بیلوں اور اپنے سروں پر گائیں لادے چشمے کا رخ کرتے۔

ان میں ایک نوجوان خان بیگ بھی تھا جسے لوگ بیگ کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ وہ آتے جاتے لوگوں کو بڑے دلدوز دہے سناتا۔ بہاولپور میں وہ کافی عرصہ مزدوری کرتا رہا تھا اس لئے اسے خواجہ فرید کی بہت سی کافیاں یاد تھیں۔ جب بیگ گاؤں سے نکلتا تو لوگوں کا ایک اچھا خاصا مجمع اس کے ہمراہ ہو جاتا۔ دو شیرائیں بھی کالے تہہ باندھے اور سفید دوپٹے اوڑھے کھسر پھسر کرتی گھروں سے نکلتیں اور بیگ کے گانے سننے کے لئے پانی کا بہانہ گھڑ لیتیں۔ روڑے کی وجہ سے سب اداس ہو گئے تھے اس لئے ان میں سے کئی کافیاں سن کر رو دیئے اور کہتے۔ ”جیتا رہ بیگ۔ خواجہ فرید کی کافی اور بیگ کی آواز۔ سونے پر سہاگہ اسی کو تو کہتے ہیں!“

اور ایک روز جب بیگ عمراں کے آنگن میں سستا رہا تھا تو لوگوں نے اسے مجبور کیا کہ وہ بوڑھے میاں کو کچھ سنائے۔ اس نے خالی گائے گرا ننگی میں ایک موٹا سا چھلا پٹنا خواجہ فرید کی کافی الاپی اور جب اس نے آخری بول گائے کہ۔

سونیاں نال نبھاوے ہر کوئی
توں کو ہمیں نال نبھا!

تو عمراں کا بوڑھا باپ بلبلاتا اٹھا۔ لٹھ ٹیکتا بیگ کے پاس آیا اور بولا۔ ”جیتا رہے بچے۔ تیری آواز میں شہد ہے!“ بیگ مسکرانے لگا تو پٹکھا جھلتی ہوئی عمراں نے اس کے خشک ہونٹوں پر خون پھوٹا دیکھا۔ بھوری پٹریوں سے یہ رستا ہوا خون اس کے باپ کی تائید کر رہا تھا۔

اس روز عمراں کو خلاف معمول خوش خوش دیکھ کر بوڑھے نے کہا۔ ”بیٹی۔ آج تو رسولؐ کی نعت ضرور گائے گی، ہے نا؟ آج تو اداس بھی نہیں اور گھر کا کام کاج بھی بڑے شوق سے کر رہی ہے!“

لیکن عمران نے اسے نال دیا۔ اس رات اس نے تہہ کر لیا کہ وہ نعت بالکل نہیں گائے گی، کبھی نہیں گائے گی۔ اتنی رونق رہتی ہے اس کے گھر میں۔ جلسہ سالگاہ رہتا ہے! بارش ہو گئی تو یہاں چشمے پر کون آئے گا!

سور تک وہ مختلف بے بنیاد خیالات کے پھر پھڑاتے ہوئے لہادوں میں گھری رہی اور جب سب گھر والے سو گئے، تو وہ باہر آنگن میں آ گئی۔ یونہی بے مطلب ادھر ادھر گھومتی رہی۔ باڑے کا کھٹکا اتار کر پھر لگا دیا۔ گائروں کو گھما کر دیوار سے ٹکایا۔ جھاڑو کے تنکے جوڑتی رہی اور جب اندر جانے لگی تو اس کے کانوں میں اچانک کسی کے گانے کی بھنک پڑی۔ اسے بیکر والی بھتی کی داستانیں یاد تھیں جو روڑے کے دنوں میں زور زور سے گاتی ہے، سینہ کو ٹپتی ہے، بال نوچتی ہے، اور راہ چلتے کی گردن پر سوار ہو کر اس کا حلق اپنے گھٹنوں میں دبا کر چرمر کر ڈالتی ہے!

لیکن کچھ دیر بعد گانا بند ہو گیا۔ اسے کنکر لڑھکنے کی آواز سنائی دی۔ بھتی کے ڈر کے مارے وہ دیوار سے چپٹی گئی۔ اچانک ایک سایہ اس کے آنگن میں آ کر رک گیا۔ کاندھے پر سے گاگر اتار کر ایک طرف رکھ دی، باہیں تان کر ایک گھری سانس لی اور پھر باڑے کے ساتھ ساتھ ہولے ہولے شملنے لگا، جیسے کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش میں ہے!

عمراں کو اس کی حرکات پر شبہ ہونے لگا۔ دیوار سے ہٹ کر بولی۔ ”کون ہے رے!“

”حقہ ہو گا؟“ گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

”پر تو ہے کون؟“ عمراں نے پوچھا۔

”بس!“

بیگ ہنسنے لگا اور گھر اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”بابا کو سلام کہہ دینا، ورنہ کہہ دوں گا عمر اس رات آنگن میں گھوم رہی تھی۔“

”جارے“ — اور پھر نہایت محبت بھرے انداز میں بولی۔

”چغلیو!“

بیگ چلا گیا تو وہ دیر تک دیا سلائی کی ڈبیا اپنی انگلیوں میں گھماتی رہی۔ اور جب وہ دبے پاؤں مکان کے اندر جانے لگی تو دلہیز سے ٹکراتے ٹکراتے بچی! بیگ نے ڈھلان اتر کر خواجہ فرید کی کافی الاپنا شروع کر دی تھی۔

عشق فرید النبی لائی
جل گیا مفت بچارا

جیسے کھنڈروں کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے سوراخوں سے ہوائیں چنچنی ہوئی گزرتی ہیں، بس اسی طرح بیگ کے الاپے ہوئے یہ بول عمر اس کے کانوں کے قریب بے حد تیز اور مسلسل سرسراہٹیں پیدا کرنے لگے۔ اندر کھاٹ پر بے جان گیلی کی طرح جاگری۔ کروٹ بدلی، باہیں اور ناگئیں پھیلا دیں، گھڑی سی بن گئی، اندھیرے کمرے میں اسے اندھیرے سے بھی اندھیری پر چھائیاں ابھرتی دکھائی دیں۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور پھر اس کے سامنے ایک ٹانگ سا ہونے لگا۔

اس نے دیکھا کہ دوپہر کا وقت ہے۔ آسمان بالکل صاف ہے۔ جھلسی ہوئی چٹانوں کی سطح بھاپ کی طرح کپکپا رہی ہے۔ اس پاس ٹنڈمنڈ درختوں پر کبڑے ٹنوں کے سائے میں پرندے بیٹھے ہانپ رہے ہیں اور گاؤں سے ادھر ابھرتی ہوئی پگڈنڈی پر بیگ آ رہا ہے۔ کندھے پر پگڑی اور پگڑی پر گھڑا ہے اس کے بال کبھی کبھی ہوا میں لہرا کر اس کے ماتھے پر پھیل جاتے ہیں اور وہ انہیں جھٹکا کر پھر پیچھے ڈال دیتا ہے۔ اس کی نظریں عمر اس کی ڈھوک پر جمی ہیں اور خود

عمر اس ایک کانٹوں بھری جھاڑی کی آڑ میں بیٹھتی ہے دم ہو رہی ہے۔ بیگ خواجہ فرید کی کافی الاپتا ہے۔ کبڑے ٹنوں پر پرندے اپنے پر پھیلاتے اور سیٹے ہیں۔ چٹانوں پر لرزتی ہوئی بھاپ ایک لمحہ کے لئے قہم جاتی ہے۔ اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر سوکھی ہوئی پھلاہوں میں ساز سے بجنے لگتے ہیں۔ بیگ اس کے قریب پہنچتا ہے تو وہ جھاڑی کی آڑ سے لپک کر اس کے سامنے آ جاتی ہے۔ وہ تیوراً کر پیچھے ہٹتا ہے اور گھر اس کے کندھے سے گر کر ڈھلان پر لڑھکتی لڑھکتی بجتی، جگہ جگہ پر گلابی ٹھیکریاں بکھیرتی، اندھیرے کھڈ میں کھو جاتی ہے۔ بیگ گھبرا کر نیچے کھڈ میں دیکھتا ہے۔ عمر اس زور زور سے ہنستی ہے اور پھر بیگ بھی اس ہنسی میں شامل ہو جاتا ہے!

بیگ عمر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور ڈھوک پر سے کسی ان دیکھی انجانی پگڈنڈی پر چلنے لگتا ہے۔ اچانک پگڈنڈی پر نرم نرم سبزہ بچھ جاتا ہے۔ آس پاس عجیب عجیب جھاڑیوں میں عجیب عجیب پھول کھل اٹھتے ہیں۔ پھلاہوں اور صنوبروں کی ٹہنیاں پتوں کے بوجھ سے جھک جاتی ہے۔ پرندے چھماتے اور پھریریاں لیتے فضا میں گیندوں کی طرح لڑھکتے لگتے ہیں۔ پگڈنڈی اوپر ہی اوپر اٹھتی جاتی ہے۔ بیگ کی انگلیاں تپ جاتی ہیں۔ عمر اس کی انگلیاں پسچ جاتی ہیں۔ دونوں مسکرا رہے ہیں۔ بیگ کے بال اس کے کانوں پر اڑ رہے ہیں۔ عمر اس کا دوپٹہ سر سے ڈھلک کر محلی پگڈنڈی پر گھسٹا آتا ہے اور بادلوں کی آڑ سے نکلتی ہوئی پہلی کرنوں میں اس کے بال سونے کے مہین تاروں کی طرح چمک اٹھتے ہیں۔ اور جب یہ بال لہراتے ہیں تو یہ کرنیں ان پر قوس قزح سی چمڑک دیتی ہیں۔

دور، سب سے اونچے پریت کی سب سے اونچی چوٹی پر گاؤں کی مسجد کا سا مینار ابھر آیا ہے۔ وہ دونوں وہاں پہنچتے ہیں تو ہوائیں اور تیز ہو جاتی ہیں۔ ان کے کپڑے ہوا میں پھڑپھڑاتے ہیں۔ بیگ مسکرا کر عمر اس کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے

اور وہ گھبرا کر اس کے آغوش میں گر جاتی ہے۔ آسمان پر بادلوں کے پھاڑ سے اُٹھ آتے ہیں۔ تب کہیں دور سے گرج بھی سنائی دیتی ہے۔ ننھی ننھی بوندیں پڑنے لگتی ہیں۔ ہوا خشک ہو جاتی ہے۔ سورج کی کرنیں سمٹ کر ایک ڈراؤنے بادل میں چھپ جاتی ہیں اور چوٹی پر ابھرے ہوئے مینار کی آخری بلندی پر بیٹھ کر بیگ عمراں کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیتا ہے اور ایک کافی گاتا ہے۔ جس میں عمراں کے بالوں اور آنکھوں کا ذکر ہے۔

اور جب گرج تیز ہو جاتی ہے اور بوندیاں گھنی پڑنے لگتی ہیں تو وہ عمراں کی ٹھوڑی پکڑ کر کہتا ہے۔ ”عمراں۔ اب تیری باری ہے۔ مگر رسولؐ کی نعت سناؤ گی تو سنوں گا۔ بارش کھل کر نہیں پڑ رہی اور میں گھرے اٹھاتے اٹھاتے تھک گیا ہوں۔“

عمراں پوچھتی ہے۔ ”مگر تم جیسے پر آنا تو نہ چھوڑ دو گے؟“

اور بیگ ہنس کر کہتا ہے۔ ”بھولی۔ ارے اب پانی بھرنے آتا ہوں“ پھر

تمہیں دیکھنے آیا کروں گا۔“

”سچ؟“ عمراں پوچھتی ہے

”سچ“ بیگ جواب دیتا ہے

اور عمراں نفرتی تان اڑاتی ہے۔

مدینے دی بدلی۔

اچانک جھونکے طوفان کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ بادل زور سے

کڑکتا ہے موسلا دھار بارش برسنے لگتی ہے۔ ہوا کی تیزی اور بارش کی شدت

سے بیگ اور عمراں کے پاؤں اکٹڑ اکٹڑ جاتے ہیں۔ ایک زہرہ گرد از کڑک کی

آواز سنائی دیتی ہے۔ مینار جڑ سے اکٹڑ کر نیچے کھڈوں کی طرف لڑھکنے لگتا ہے

اور اس کے ساتھ ہی بیگ اور عمراں بھی۔ عمراں بھی!

اس کی چیخ نکل جاتی ہے اور جب آنکھیں مل کر ادھر ادھر دیکھتی ہے

تو وہ اپنے مکان میں موجود ہے۔ دروازہ بند ہے۔ لیکن جھریوں سے صبح کی روشنی اندر چھن رہی ہے، اس کے والدین زور زور سے ہنس رہے ہیں اور اس کا شریر بھائی تالیاں بجا بجا کر ناچ رہا ہے، باہر بادل زور سے گرج رہے ہیں، کبھی کبھی بجلی بھی چمکتی ہے۔ اور چھت پر اتنی تیز اور گنجان بوندیں پڑ رہی ہیں جیسے چھت ابھی چھلنی کی طرح ٹپکنے لگے گی۔

عمراں گھبرا گئی۔ گھوم کر کھاٹ سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی اور آنکھیں

پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس کا باپ بولا۔ ”اری تو اتنی گھبرا کیوں رہی

ہے؟ تو نے ہمارے کسے سے رسولؐ کی نعت نہ گائی، پر جو نبی تو نے نیند میں

”مدینے دی بدلی“ چھیڑی۔ ادھر پچھتم سے۔۔۔۔۔ مدینہ پچھتم ہی کی طرف تو ہے

ایک بدلی انھی۔ آن کی آن میں آسمان پر چھا گئی اور وہ بارش ہوئی

ہے، وہ بارش ہوئی کہ شاہو کا مدرسہ ڈوبنا نظر آتا ہے!“

”اور خشی جی بھی!“ شاہو بولا۔

”ہاں ہاں۔ وہ اللہ مارا بھی!“ بڑھیا ققمہ لگا کر بولی۔

مگر عمراں چیخ اٹھی۔ ”میں نے نعت نہیں گائی!“ وہ ننگے پاؤں

باہر دوڑ گئی۔ ”خدا کی قسم میں نے نعت نہیں گائی۔ میں نعت کیوں گائی۔۔۔۔۔

ارے پگھٹ تو چھلک رہا ہے۔۔۔۔۔ اب کیا ہو گا!“

دیوانوں کی طرح اس کے ماں باپ باہر دوڑے۔ ”دماغ چل گیا

ہے۔“ ”کچی نیند میں تھی“۔۔۔۔۔ ”ہولے ہولے جاؤ، مگر سے چھلانگ نہ لگا

دے“۔۔۔۔۔ ”وہ اس کا دوپٹہ اڑ گیا“۔۔۔۔۔ ”چولے کے بٹن کھل گئے ہیں

کعبخت کے“۔۔۔۔۔ ”دیکھ نہ پائے تمہیں ورنہ کود جائے گی پاڑ سے!“

۔۔۔۔۔ ”کلمو ہی!“

عقب سے بوڑھے نے چیختی ہوئی عمراں کو اپنے مرجھائے ہوئے

بازوؤں میں جکڑ لیا۔ چھرر سے اس کے کپڑے پھٹنے لگے۔ لیکن وہ اسے گھسیٹ

کر اندر لے گیا۔ شاہ محمد منہ میں انگلی ڈالے دلہیز کے پاس حیران کھڑا تھا، بڑھیا ایک میلی بوتل سے شمد نکال رہی تھی اور عمریں چلا رہی تھی۔ ”میں نے نعت نہیں گائی۔ میں نعت کیوں گائی!“

چیننے چیننے اس کی آنکھ لگ گئی۔ اور جب کچھ دیر کے بعد وہ انھی تو اس کا باپ اس کی کھاٹ کے قریب ہی ایک بست بڑی آگ جلائے اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔ اس کی ماں اس کے پاؤں کے تلوے مل رہی تھی اور شاہ محمد روئی صورت بنائے اپنے بالوں میں انگلیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھا تھا!

عمریں کو ہولے ہولے رات کا خواب اور اس کے بعد کے واقعات یاد آنے لگے۔ وہ باہر صحن میں آئی تو دور پگھٹ پر لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ بارش ختم چکی تھی۔ پہاڑ دھل کر اودے نکل آئے تھے۔ برساتی نالے چنگھاڑ رہے تھے اور بھیگے ہوئے پرندے کبڑے ٹہنوں پر بھولی ہوئی بولیاں الپ رہے تھے! وہ اچانک پلٹی۔ ایک پھراٹھا کر بڑی بڑی چٹانیں بجائیں کہ شاید بیک کی گائی ہوئی کافین کی گونج، جو ان میں سما گئی تھی، باہر ابل پڑے، لیکن چٹانیں پھٹے پھٹے قہقہے لگا کر خاموش ہو گئیں۔ یکایک گاؤں میں ڈھول بجنے لگا اور پگھٹ پر جھکے ہوئے سائے پلٹ کر تیز تیز قدم اٹھانے لگے۔

”کیا بات ہے ماں؟“ عمریں نے اپنی خوفزدہ ماں سے پوچھا۔ جو اس کے چٹانیں بجانے پر حیران ہو رہی تھی۔

بڑھیا ہراساں لہجے میں بولی۔ ”وہ گویا چھو کر آیا کرتا ہے نایاں چٹے پر۔ اس کا بیاہ ہے“

اور عمریں نے آسمان کی طرف دیکھ کر زیر لب کہا۔ ”واہ ری مدینے کی بدلی!“

جلسہ

غریب ہندوستان کے امیروں کا ایک غریب قصبے میں جلسہ ہونے والا تھا۔ دور دور سے بڑے بڑے مقرر آئے تھے۔ ڈھیلی ڈھالی عباؤں اور موٹے سیندوری تنکوں والے مقرر جن کے شدھ کھدر کے لباسوں سے عطر کی لپٹیں چھلکی پڑتی تھیں اور جن کی بھری بھری کلائیوں پر سنہری گھڑیاں جگ رہی تھیں۔ انکی لچھے دار تقریریں سننے کے مشتاق دہقان جن کے جسم کے مسام مہین و حول میں اٹے رہتے تھے اور جن کی کلائیوں پر موٹے موٹے میالے بال لپٹے رہتے تھے، قصبے میں آنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ یہ قصبہ شہروں سے بہت دور ایک کھنے جنگل کے کنارے پر تھا۔ اس کے مغرب کی طرف ایک برساتی نالہ تھا جس میں گاؤں کے بچے گول اور صاف چٹمقاق کے گھروندے بنا کر لال بادشاہ سبز پری اور کالے دیو کا سوانگ بھرا کرتے تھے اور گاؤں کے مشرق کی طرف ایک بہت بڑا کھنڈر تھا جس کے متعلق قصبے میں یہ عجیب و غریب بات مشہور تھی کہ جب طوفان نوح آیا تو یہ محل آسمانوں سے ان لوگوں کے لئے اتارا گیا جنہوں نے غریبوں کے پیٹ بھرے اور مسکینوں کی دعائیں لیں۔ یہ محل طوفان کے دوران میں ہوا میں لٹکا رہا۔ اور جب طوفان ختم ہوا اور سمندر خشکیوں میں تبدیل ہو گئے اور خشکیاں سمندروں میں، تو اس محل کو چار فرشتے ہوا سے اتار

کر یہاں لے آئے کہ غریبوں کے پیٹ بھرنے والے اور مسکینوں کی دعائیں لینے والے اطمینان سے باہر نکل سکیں لیکن یہ دیکھ کر محل کو سہارا دینے والے فرشتے پتھر کی بے جان مورتیوں میں تبدیل ہو گئے کہ اس محل سے کوئی انسان باہر نہ آیا۔ صرف ایک بوڑھا سا کوا لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا اور اپنے ٹوٹے ہوئے پر پھڑپھڑاتا دور نچی کبھی جھاڑیوں کے جھنڈوں میں غائب ہو گیا۔ کہتے ہیں اس کوے نے صرف اس لئے ایک ننھے کے ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا نہیں چھینا تھا کہ اس ننھے کی معصوم آنکھوں میں تین دن کی بھوک نظر آتی تھی۔

باہر سے آئے ہوئے مقرروں نے اس محل کے پراسرار کھنڈر دیکھے تو حیران ہوتے رہے کہ لوگ اگلے وقتوں کی بے سمجھے بوجھے کیوں تعریفیں کرتے ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایسا نہ نکلا کہ اس محل میں قدم دھرنے کا مجاز ہو سکتا۔ اور آج اس زمانہ میں — کہ یہ زمانہ سب زمانوں سے برا سمجھا جاتا ہے — ہم لوگ راتوں کی نیندیں اور دنوں کے آرام کو حرام کر کے تپتی دوپہروں میں سفر کرتے ہوئے اس قصبے میں آئے ہیں، صرف اس لئے کہ غریبوں کو جینے کا سلیقہ سمجھا سکیں اور مسکینوں کی دلجوئی اور دادرسی کریں — ان چار سفید مورتیوں کے پروں اور سروں پر ہاتھ پھیرے گئے جنہوں نے اس محل کو طوفان کے دوران میں اپنے کندھے پر اٹھائے رکھا۔ ان میناروں پر آنسو بہائے گئے جو جھکی ہوئی چھتوں پر لیٹے جیسے دم توڑ رہے تھے۔ ان میڑھیوں کو بہت احترام سے چھوا گیا جن پر ان دنوں کوئی انسان قدم نہ رکھ سکا۔

شام کے وقت ایک میدان میں گیسوں کی روشنی کی گئی۔ گاؤں والوں نے چندہ جمع کر کے گیسوں پھولوں اور ایسی ایسی چیزوں کا انتظام کر رکھا تھا جن کا انہوں نے کبھی نام تک نہ سنا تھا۔ بچے جوان اور بوڑھے اپنے اپنے دو گز پلوں کے

کنارے میں دو دو تنوری سوکھی روٹیاں پٹاوری مگر اور پیاز باندھے دور دور سے چل کر آئے اور اسکول کے باسٹربی نے برساتی نالے کی ایک اندھی کھائی کے سفید گول پتھر اور بھورے اور گلابی پتھرقاق چن کر میدان کے عین وسط میں ایک دائرہ بنایا جس کے اندر قدم دھرنے والوں کے لئے قتل سے بڑا جرم تھا۔ اس دائرے میں بہت چوڑے اور اونچے تختوں پر ذیلدار رئیس خان، صوبیدار اللہ دین، پٹواری لکھ چند، مسٹر عطا اختر بی۔ اے اور جعدار انوپ سنگھ کے ہاں سے کرسیاں اور میزیں اکٹھی کر کے سجائی گئیں۔ علاقے میں سروسوں کے پھولوں کی کثرت تھی اس لئے جگہ جگہ چوہی دروازوں پر سروسوں کی پھول بھری ڈالیاں لپیٹی گئیں اور پنڈال کو سروسوں کے پھولوں کی زنجیریں پہنا کر جکڑا گیا۔ اس زعفران زار میں بیٹھے ہوئے ڈھیلی ڈھالی عباؤں اور موٹے سیندوری تنکوں والوں کی گردنوں میں چنبیلی کے ہار تھے جو شر سے منگوائے گئے تھے اور گو وہ پیارے لال ڈرائیور اور مند لال کلینر کی نالافتی کیوجہ سے مسلے گئے تھے مگر آخر وہ چنبیلی کے ہار تھے اور شروں سے منگوائے گئے تھے۔ سروسوں کے پھول خوبصورت سسی مگر ان میں چنبیلی کی سی بو باس کہاں، اور پھر چنبیلی کا عطر بنتا ہے اور سروسوں کا تیل — اور اس لئے مسلے ہوئے ہاروں سے ان کی گردنیں پٹی پڑی تھیں۔ پنڈال پر ان مسمانوں کے لئے دریاں بچھائی گئیں تاکہ ان کے جوتوں کے تلوے میلے نہ ہوں۔ اور میدان کے ہر طرف خاک کے بھورے قطعوں پر جفاکش دھقان لائیاں زمین پر لٹائے لمحہ لمحہ بھر بعد تھوک نکل کر کہتے تھے۔ ”اے کب انھیں گے مولوی جی۔“

اور ادھر سے جواب آتا۔ ”اے رہنے دو مولوی کو۔ وہ جو گیا بانا اپنے جو پنڈت جی بیٹھا ہے نا۔ وہ جس کے ہاتھ میں سنہری عصا ہے، راج کشور دکاندار کہہ رہا تھا کہ جب وہ گانے لگتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی لڑکی کے کنگن سے کانسی کا کٹورا نکل گیا اور اسکی جھنجھناہٹ دیر تک کانوں میں گونجتی

رہی۔ آواز کی لہروں میں ایسی گنگنٹیاں چھوڑتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کوئی زخمی ناگ بل کھائے تھرکا جا رہا ہے۔ لے سن!“

دم بخود مجمع کی نظریں ایک بزرگ پر پڑیں جنہوں نے ایک ڈھیلی ڈھالی سبز عبا پہن رکھی تھی۔ وہ آرام کرسی پر سے کھنکارتے ہوئے اٹھے۔ ان کے پھولے ہوئے گال گیس کی سفید روشنی میں دمک رہے تھے جیسے دہقانوں کے رخساروں کی ابھری ہوئی سانولی ہڈیوں کی پھبتی اڑا رہے ہیں۔ عربی زبان میں دو چار جملے گنگنا کر انہوں نے اپنی گونجیلی آواز کو بلند کرتے ہوئے فرمایا۔

”میں اتنے لمبے کٹھن سفر طے کر کے آیا ہوں تو یہ سب تم بھائیوں کے بھلے کے لئے۔ مرحوم والد محترم کے عرس شریف کے تمام انتظامات اپنے چھوٹے بھائی کے سپرد کر کے صرف اس خاطر حاضر ہوا ہوں کہ آپ کے دلوں پر سے مایوسیوں کے بھاری پردے اٹھا سکوں اور بتا سکوں کہ دعا میں کتنی قوت ہے۔ ذاتی طور پر میرا تو دعا میں اس قدر یقین ہے کہ بل چلانا چھوڑ دو، کام کے پاس نہ پھنکو، لمبی تانے پڑے رہو، مگر پانچ وقت نماز کے بعد اپنے خدائے علیم و بصیر کے حضور میں خشوع و خضوع سے سر رگڑنے کے بعد سچے دل سے گڑ گڑا کر دعا مانگو۔ رقتِ قلب سے روؤ اور کہو کہ اے پروردگار بے ہمتا اور اے آقاے جلیل و جمیل۔ ہم دکھیوں کی فریاد سن۔ ہم تیرے در کے کتے تیرے دربار کے بھکاری، تیرے حضور سر بسجود ہیں۔ تو ہم پر اپنے بے پایاں انعام و اکرام کی بارش برسا۔ میں کہتا ہوں۔ میں کہتا ہوں (اور یہاں انکی آواز بھرا گئی۔ اور آنکھیں تر ہو گئیں) میں کہتا ہوں اس طرح تمہاری مصیبتیں چٹکی بجانے میں کافور ہو جائیں گی اور تم امن چین سے اپنی زندگیاں گزار کر بہشتوں میں جا بسو گے۔ دعا ایک ایسی زبردست قوت ہے، دعا ایک ایسا تیز ہتھیار ہے کہ اس سے عسرت کے دیو کو ہلاک کیا جاسکتا ہے اور عشرت کے دروازے وا کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن دعا میں اثر ہونا چاہیے۔ دعاؤں میں اثر پیدا کرنے کے لئے دل کی

صفائی ضروری ہے اور دل کی صفائی صرف بزرگوں اور چلہ کش درویشوں کے آستانوں پر جبہ سائی سے حاصل ہوتی ہے۔ مقبروں پر چڑھاوے چڑھاؤ۔ قربانیاں دو۔ مزاروں پر قوالی کرانے میں بڑا فیضان ہے۔ اس مبارک کام میں جی کھول کر حصہ لو۔ بزرگوں کی اولاد کی خدمت کرو۔ تم ایک دو گے تو اللہ تمہیں ستر دے گا۔ تمہارا قلب آئینے کی طرح صاف ہو جائے گا اور تم پر کائنات کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ میرے مرحوم والد محترم کے حضور ایک بار بھوکا فحش آیا اور..... اور یوں حضرت مقرر اپنے والد کی قصیدہ گوئی میں کھو گئے۔ بیچارے دہقان سبحان اللہ سبحان اللہ کے نعرے بلند کر رہے تھے اور شدتِ جذبات سے مجبور ہو کر دعائیں مانگ رہے تھے، اور بہت پرے کاتنوں کی ایک باڑ کے اس طرف گاؤں کی عورتوں کا ہنگامٹ یوں کھڑا تھا جیسے کسی مصور نے آسمان سے اتری ہوئی اور دھند لکوں میں لپٹی ہوئی حوروں کی ایک تصور کھینچ دی ہے۔ گیس کی مدھم روشنیوں میں ان کے کنگن اور کنٹھے چمکتے تو لوگوں کی نظریں از خود ادھر اٹھ جاتیں اور وہیں گڑی رہ جاتیں اور پھر مولوی صاحب کی یہ آواز انہیں کنگنوں اور کنٹھوں اور ان کے ہمراہ کنگنوں اور کنٹھوں والیوں کی جنت سے اٹھا کر اس بھوری خاک پر بیٹھ ڈالتی کہ ”آخرت سے ڈرو۔ قیامت سے ڈرو۔ اور پیر کی بد دعا سے ڈرو۔ بزرگوں کے مزاروں پر چڑھاوے چڑھاؤ۔ ان کی اولاد کی خدمت کرو۔ میں اسی لئے اتنے لمبے کٹھن سفر طے کر کے تمہارے پاس آیا ہوں!“

اور اس کے بعد ایک پنڈت جی اٹھے جن کی آواز میں واقعی ایک جادو سا تھا۔ سنہرے عمامے کو کرسی کے ساتھ لٹکا کر اور گلے میں لپٹی ہوئی چادر کو ڈھیلا کر کے انہوں نے ایک لمبی اور دردناک گنگری لگائی اور فرمایا۔

من کا دیا جلایا میت کے درشن کر کے
دوبک میں گھوم آیا پیت سے من کو بھر کے

اور یونہی پیت اور میت، تن اور من، دکھ اور سکھ کا ایک جال بن کر وہ خاموش ہو گئے اور تپتی دوپہروں میں ہل چلانے والوں اور دکھتی چٹانوں پر چڑھ کر باجرے کی فصلوں سے چڑیاں اڑانے والیوں کے دلوں کو دھڑکتا چھوڑ گئے۔ لیکن اچانک انہوں نے ایک اور رنگ بدلا اور پکارے۔ ”مترو میں تمہارا ایک ادنی داس تمہارے چرنوں میں صرف اس لئے آیا ہوں کہ میں ایک ایسے اناٹھ آشرم کے لئے تم سے مدد مانگوں جس کی نوبت میرے ہی ان پاپی ہاتھوں نے رکھی تھی، اور جس میں اس نگری کے اناٹھ بالک و دیا کی دیوی کی پوجا کرتے ہیں۔ چرخہ کاتے ہیں اور آگے جا کر جیون میں آند اور سکھ پاتے ہیں۔ میرے جیون میں یہ پہلا موقع ہے کہ مسلمان اور ہندو بھائی اپنے بھلے کی باتیں سوچنے کے لئے اکٹھے بیٹھے ہیں۔ میں اسے بھارت ماتا کے لئے ایک شہ گھڑی سمجھتا ہوں اور آشاکرتا ہوں کہ میرے بھائی میرا ہاتھ پٹا کر اور پن کر کے خورسند ہونگے۔ جلسہ گاہ کے باہر چند منش میرے جیسا جو گیا پانا پننے اور جھولیاں بڑھائے کھڑے ہوں گے۔ جاتے ہوئے ان کی جھولیاں بھر دو کہ تمہیں جیون میں سکھ اور پرلوک میں شانتی ملے۔ رام رام۔“

”کیا کما اس نے؟“ ایک طرف سے آواز آئی۔

اور ادھر سے جواب ملا۔ ”پنڈت جی نے کہا کہ ہندو مسلمان بھائی بھائی ہیں اور بہت جلد ہماری سرکار قحط سالی کی وجہ سے لگان معاف کر دے گی اور رام سب کا بھلا کرے!“

یہ بات سننے والے نہایت احترام سے پنڈت جی کو دیکھنے لگے جواب منہ میں پان اور انگلیوں میں سگرٹ رکھے ہوئے تھے اور گوپان کا پتہ سوکھ چکا تھا اور سگریٹ پر شیر کے سر کا نشان تھا مگر آخر وہ پان اور سگرٹ تھے اور انہی مقدس مہمانوں کے لئے شہروں سے منگائے گئے تھے۔

بہت لمبی لمبی تقریریں ہوئیں۔ نظمیں پڑھی گئیں۔ نعرے لگائے گئے۔ اسمبلی کے ایک ممبر نے نہایت فخریہ انداز میں کہا کہ ”مجھے دیکھو۔ میں تمہارا ایک ادنی خادم سرکار عالی کے حضور تمہاری شکایتیں پہنچاتا ہوں اور تمہاری داد رسی ہوتی ہے۔ میں اپنا گھر بھول گیا۔ بال بچوں کا مجھے خیال تک نہیں۔ میری زمینیں پڑی برباد ہو رہی ہیں۔ لیکن آپ غریب بھائیوں کی خدمت کے لئے مجھے سب کچھ منظور ہے، اگر تم میرے چمڑے کی جوتیاں پن کر چلنا چاہو، تو میرا چمڑہ حاضر ہے، اور اب عنقریب نئے انتخابات آنے والے ہیں۔ کئی سر پھرے یہاں آکر میرا مقابلہ کریں گے، اور مجھے تم سے امید ہے کہ —“

یونہی قسم قسم کی تقریریں ہوئیں، دہقانوں کے بھلے کی اسی طرح تجویزیں سوچی گئیں۔ دو دو دن کے ہل چلانے کو ملتوی کرنے والوں کو زندہ رہنے کا سلیقہ سمجھایا گیا اور اس دوران میں سگرٹ اڑائے گئے۔ پان چبائے گئے۔ شربت لٹھائے گئے، اور چندے ملتے گئے۔ دہقان بھوری خاک پر آلتی پالتی مارے بیٹھے نہایت توجہ سے یہ باتیں سنتے رہے جو ان کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ جب اسمبلی کے ممبر صاحب اٹھے تو تمام جلسہ میں کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ ”ہماری سڑک برباد پڑی ہے“ ”ہمارے لئے پانی کا انتظام نہیں۔“

”ہماری فصلیں تباہ ہو گئیں مگر لگان معاف نہیں ہوا۔“ ”تھانیدار ہمیں بیگار پر پکڑ کر تنگ کرتا ہے!“ لیکن ایک بوڑھے نے چپکے سے یہ نشر سب کے دلوں میں چھو دیا کہ ”ملک بڑا آدمی ہے، اشارہ کر دے تو تم سب حوالات میں مگلتے سڑتے نظر آؤ۔ رہنے دو اپنی سڑکوں، کنوؤں اور فصلوں کو۔ تقریریں سنو اور اللہ کی قدرت دیکھو!“

اس کے بعد ذیلدار رئیس خاں اٹھا۔ اس کا گز بھر لبا کلف لگا طرا ہوا میں جھوم رہا تھا اور ریشمی ملبوس کی لہریں گیس کی روشنی میں کروٹیں بدل رہی تھیں۔ اس نے نہایت نیچے تلے الفاظ میں ایک ایسی ہستی کا تعارف کرایا جس کی

وجہ سے ذیلدار کے الفاظ میں یہ جاہل قصبہ آج بہشت بنا ہوا تھا۔ یہ صاحب گاڑی اور موٹر کار کے ذریعے ایک لمبا کٹھن سفر طے کر کے یہاں تشریف لائے تھے۔ چالیس پیتھلیس کاسن۔ واڑھی اور مونچھوں میں اس قدر تیل پڑا ہوا کہ گیس کی روشنی میں ان کے بال چاندی کے تار معلوم ہوتے تھے۔ کھدر کا لباس اور سر پر گاندھی جی کی ٹوپی جسے خود گاندھی جی نے پہننا ترک کر دیا ہے! اٹھے اور جھک کر آداب بجالائے۔ اور فرمایا۔ ”میرے خاک پر بیٹھے ہوئے بھائیو! میں تم سے بہت لمبی باتیں نہیں کروں گا۔ دو چار نکتے سمجھاؤں گا کہ انہی میں تمہارا بھلا ہے۔ پندرہ سال ہوئے میں تمہارے قصبے میں آیا تھا اور میری تقریر کے اثر سے تم سب نے ترکی اور گاندھی ٹوپی پہن لی تھی اور ہاتھوں میں سبز اور پیلے جھنڈے تھام لئے تھے۔ میں تین مہینے کے لئے جیل میں تمہاری خاطر چکی پیتا رہا اور تمہاری قربانیوں کی داستانیں سنتا رہا۔ آج میں تم سے نہیں بلکہ تمہاری ماؤں بہنوں بیویوں اور بیٹیوں سے مخاطب ہوں گا کہ سب سے پہلے ہمیں عورتوں کے سدھار کی ضرورت ہے۔ عورتیں ہماری آنے والی نسلوں کی امانتدار ہیں، ہمیں اپنی فلاح و بہبود سے بڑھ کر ان کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنا چاہیے۔ وہ ہماری اجڑی ہوئی محفلوں کی زینت اور ہمارے دکھے والوں کا سہارا ہیں۔ وہ ہماری مجلسوں کا حسن اور ہمارے گھروں کی رونق ہیں (اور یہاں ان کی آواز بھرا گئی اور باڑ کے پرے کنگن اور کنٹھے جھلکانے لگے) اگر وہ پریشان اور فکر مند ہیں تو ہمارا آرام و اطمینان کس کام کا۔ پچھلے چند دنوں سے معدے کی شکایت کی وجہ سے میرے گلے پر بھی اثر پڑا ہے اس لئے میری آواز بہت جلد تھک جاتی ہے۔ شاید کانٹوں کی باڑ کے پرے میری آواز نہ پہنچ سکے۔ میں اپنی بہنوں سے گزارش کروں گا کہ اگر وہ باڑ کے اک طرف سے ہو کر جلسہ گاہ کے قریب آجائیں تو مجھے بھی تکلیف نہ ہو گی، اور ان کا بھی بھلا ہو گا۔ شہرت کے دو گھونٹ دیجئے گا!“

کنگن اور کڑے گیسوں کی سفید روشنی میں چمکنے لگے اور عورتیں ڈری ہوئی بھیڑوں کی طرح تترہتر ہونے لگیں۔ دو چار ٹولیاں قصبے کی طرف چل دیں اور دو چار جلسہ گاہ کے قریب آگئیں۔ لیکن آنے والیوں کی کلائیوں میں کنگن نہ تھے۔ یہ قصبے کی بڑی بوڑھیاں تھیں اور جانے والیاں وہ معصوم کنواریاں اور باحیاد لہنیں تھیں جو گیس کی سفید روشنی میں غیر مردوں کی نظروں کے چنگل میں گھر جانا شاید برا سمجھتی تھیں!

میرے قریب ہی ایک بہت بوڑھا شخص نوار کی ڈبیا کو انگوٹھے سے بجاتے ہوئے بولا۔ ”بچے۔ وہ مولیٰ کون ہے؟“

میں نے اسے مولوی جی کا نام بتایا تو اچانک اس کے فق چہرے پر وحشت برسنے لگیں۔ ہاتھ سے نوار کی ڈبیا چھوٹ کر تہ بند پر گر گئی۔ نحیف آنکھوں کی پٹلی جیسے کافور ہو گئی۔ ناک کی ہڈی اور ماتھے کے ابھار پر پینہ پھوٹ نکلا۔ اٹھا اور لڑکھڑا کر مجھ پر آن گرا۔ پھر اٹھا اور چیخا ہوا پنڈال کی طرف بڑھنے لگا۔ ”ارے رستہ دو مجھے۔ ہٹ جاؤ۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ جانے دو مجھے۔ مجھے روکو نہیں۔ میں آج مدتوں کا بھولا ہوا فرض ادا کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ گرتا پڑتا باہیں جھنکاتا، آگے ہی آگے بڑھنے لگا۔ پڑی کھل کر اسکی گردن میں اٹک گئی۔ پھٹا ہوا لباس پھڑ پھڑانے لگا۔ وحشیانہ انداز میں پنڈال پر نظریں گاڑے چلائے جا رہا تھا۔ ”مجھے رستہ دو۔ جانے دو مجھے!“

پہلے تو لوگ چپ چاپ اسے گھورتے رہے مگر جب سارے پنڈال نے ذیلدار کی طرف دیکھا جو بوڑھے کو قابو میں لانے کے احکام صادر کر رہا تھا تو سارا مجمع کھڑا ہو گیا۔ ذیلدار کا طرہ گیس کے پاس لہرانے لگا اور مولوی جی کرسیوں کی آخری قطار تک پیچھے ہٹ گئے۔ ادھر سے دو کالے رنگ کے چوکیدار جھپٹے اور بوڑھے کو دبوچ کر مجمع سے باہر لے گئے۔ لوگوں کی افرا تفری

سے اٹھا ہوا گرد و غبار دھندلے مرغولے بکرگیسوں کے آس پاس منڈلانے لگا۔
لوگ ایک دوسرے سے اس بوڑھے کے متعلق پوچھنے لگے۔ میں نے بھی ایک
فحش کو کاندھے سے ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اے بھائی۔ یہ بوڑھا کون تھا!“
”خدا جانے!“

پیچھے سے ایک بوڑھے نے میری پیٹھ کو چھوتے ہوئے کہا۔ ”لے میں
بتاؤں بچے!“

میں نے پلٹ کر دیکھا تو ہمارے گاؤں کا بوڑھا دھوبی بیٹھا مسکرا رہا تھا
اور لال مسوڑھوں کے پیچھے اس کی گول مول زبان پڑی کانپ رہی تھی۔ مجھے
دیکھتے ہی بولا۔ ”اے بیٹا احمد، تو بھی خاک پر بیٹھ گیا؟ وہاں کرسیوں پر تجھے کوئی
جگہ نہ ملی؟ بی۔ آپاس اور دھول پر بیٹھے۔ لے یہ چادر بچھا دوں!“
میں نے کہا۔ ”بابا رہنے دو چادر کو۔ مجھے اس بوڑھے کے متعلق کچھ
بتاؤ“

اس نے مجھے قریب کھسک آنے کا اشارہ کیا اور پھر اپنے ڈھیلے ڈھالے
ٹھنڈے بے رونق ہونٹ میرے کانوں کے قریب لا کر بولا۔ ”لے سن۔ یہ
بوڑھا ذیل دار رئیس خاں کا مزارعہ تھا۔ اس کی زمین پر بل چلایا کرتا تھا۔ پندرہ
سولہ سال گزرے یہی مولوی گاؤں میں آیا۔ اس کی خاطر مزارات کے لئے
ذیلدار نے ہر گھر سے چندہ اکٹھا کیا۔ بوڑھا بے چارہ غریب آدمی چندہ ادا نہ کر
سکا۔ ذیلدار نے اسے گھر کا اور کہا کہ وہ چندہ لئے بغیر چین نہ لے گا اور بچے! تم
یہ سن کر حیران ہو گے کہ اس نے بوڑھے سے چندہ لے لیا۔ وہ یوں کہ رات کو
کسی وقت جب بوڑھے کی آنکھ کھلی تو اس کی اکلوتی جوان لڑکی کا بستر خالی پڑا
تھا۔ وہ ذیلدار کے گھر کی طرف بھاگا۔ اور وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ذیلدار
ایک کمرے کے باہر خود ہی ایک لٹھ تھامے بیٹھا ہے۔ ذیلدار کا اشارہ پاتے ہی
ایک کتا ایک طرف سے بچھا اور بوڑھے سے لپٹ گیا۔ اسے کئی جگہ سے کاٹ

کاٹ کھایا لیکن بوڑھا آگے بڑھتا گیا اور ذیلدار سے جا کر پوچھا کہ میری لڑکی
کہاں ہے، اور ذیلدار نے بتایا کہ وہ اندر مولوی جی کے پاس ہے اور تجھے
پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کہ تیری لڑکی اپنا کنوارا پن لٹا کر تیرا چندہ ادا کر
رہی ہے! بوڑھے نے چیخا چاہا مگر ذیلدار کی لٹھ سیدھی اس کے دماغ پر پڑی۔
چوکیدار اسے اٹھا کر باہر گلی میں لے آئے۔ اس دن سے اس کا دماغ چل گیا
ہے۔ کسی سے بات نہیں کرتا۔ جو فحش ملے اسے پاگلوں کی طرح گھورتا اور
نسوار کی چٹکی منہ میں رکھ کر آگے چل دیتا ہے۔“
”اور اس کی لڑکی؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ بھی سنو گے؟“ بوڑھے نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کہتے
ہیں وہ صبح کو مولوی کے چنگل سے نکل کر برساتی نالے کی ایک اندھی کھائی میں
بیٹھی رہی۔ لوگ اسے سمجھانے بھانے آئے لیکن وہ وہیں پڑی رہی۔ اس کے
بال کھلے تھے، چولا پھٹا ہوا تھا، اسے کوئی احساس نہ تھا کہ اس کا سینہ نظر آ رہا
ہے اور کی پنڈلیاں صاف دکھائی دے رہی ہیں۔ دو چار دن کے بعد وہ وہاں سے
اٹھ کر کہیں چلی گئی۔ کہتے ہیں آج کل وہ لاہور کے چٹکے میں بیٹھی ہے!“
گیسوں کی روشنیوں میں لپٹے ہوئے مولوی نے چنگھاڑ کر کہا۔ ”میں
اپنی بہنوں کو کس طرح سمجھاؤں کہ آنکھیں نیچی کر کے چلنے میں کتنا بڑا ثواب
ہے۔ میں اپنی ماؤں کو۔۔۔!“

اور اچانک ایک کمزور سا بھولا بھٹکا کوا کھنڈر کی طرف سے رات کے
اندھیرے میں پھڑپھڑاتا ہوا آیا اور مولوی جی کے سامنے ایک گیس سے ٹکرا کر
نیچے گر گیا اور پنڈال کے تختوں تلے گھس کر چھپ گیا۔ بہت دور بوڑھے کی دہلی
دہلی چیخ سنائی دی۔ ”مجھے آج مدتوں کا بھولا ہوا فرض ادا کرنے دو!“ اور
تاروں بھرے آسمان کے مقابل ابھرے ہوئے آسمانی محل کے کھنڈر کانپے اور
منجھ فرشتے جیسے اپنے سکین پر پھڑپھڑا کر اسی طرح سن ہو کر رہ گئے!

بھی ملائت ہے لیکن بجتے ہوئے انگاروں پر ابھری ہوئی راکھ کی طرح۔ اس کی چال میں بھی لچک ہے لیکن ٹوٹی ہوئی ٹنٹی کے آخری مایوسانہ ہلکورے جیسی۔ یہ گھاس کا گٹھا جو اس کے سر پر ہے اس کی سپید گردن کی رگوں کو خیمے کی طنابوں کی طرح کھینچے ہوئے ہے۔ پاؤں میں جوتا ہے جس کے تلے میں سوراخوں کی وجہ سے چھترے دبا رکھے ہیں اور ایک چھترہ سوراخ سے باہر لٹک کر میلی گلی میں ایک آڑی ترچھی لکیر بناتا گھنٹا آتا ہے۔ جیسے پیچاری اپنی تقدیر آپ ہی لکھے جا رہی ہے! — ٹیڑھی بیٹگی سی لکیر، ٹکوں میں لہراتی، کانٹوں میں الجھتی، کوڑے کے ڈھیر میں سے ہوتی دھول کی گہرائیوں میں زخمی سانپ کی طرح دوڑی جا رہی ہے۔

اس پیچاری کو گھر جا کر بہت سے کام کرنا ہیں۔ پہلے تو گھاس کا گٹھا زمیندار کے چھتر تک پہنچایا جائے گا جہاں زمیندار کے ڈھور ڈنگر منہ اٹھائے اس کے خطر ہوں گے۔ واپس آ کر یہ گھر کے صحن میں جھاڑو دے گی۔ اس کے لمبے گھنگریالے بال جو اس کی پیٹھ پر کالے بادل کی طرح پڑے ہیں، مٹیالے ہو جائیں گے، اس کی جذبات بھری پلکیں جن کا تناؤ کلیجوں پر نیزے کی انی کی طرح پڑتا ہے، دھول سے اٹ جائیں گے۔ اس کا پھٹا ہوا دوپٹہ جس کے ایک کونے میں اس نے شاید گڑیا پیاڑ باندھ رکھی ہے، ڈھلک کر ایک طرف گر جائے گا اور اس کی ماں پکارے گی۔ ”اری سر پر دوپٹہ اوڑھ لے۔ کنواری لڑکیاں ننگے سر نہیں پھرا کرتیں، ورنہ پگلی آسمان ٹوٹ پڑتا ہے“ وہ آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرائے گی۔ ایسی مسکراہٹ جیسے زندگی سے مایوس انسان کی جسے طبیب لاعلاج کہہ کر چھوڑ گئے ہوں، ایک سمجھنے بوجھنے والے کی مسکراہٹ جسے سمجھ بوجھ کے ابتدائی اصول سمجھائے جا رہے ہوں۔ — نہایت تلخ اور نکیلی مسکراہٹ، جس کی تلخی اور جس کی نوک خود اس کی روح محسوس کرتی ہے۔ وہ مسکرا کر دوپٹہ سر پر ڈال لے گی اور یونہی جھاڑو بچھرتی جائے گی۔

میرا دیس

میں جس دیس کی بات کرتا ہوں وہ اس دیس سے بالکل الگ ہے جہاں گاڑیاں چلتی ہیں اور موٹریں بھنھناتی ہیں۔ جہاں ریشمی ساریاں سرسراتی ہیں اور باسی ہونٹ ہمیشہ لپ اسٹک کے محتاج رہتے ہیں۔ میں تو اس دیس کی باتیں کرتا ہوں جہاں چلنے کے لئے پاؤں استعمال کئے جاتے ہیں، اور سنگار کے لئے ارغوانی پھول۔ وہاں ایسی صاف سڑکیں بھی تو نہیں ہوتیں۔ پتلی پتلی پگڈنڈیاں کھیتوں میں لہراتی، ڈھیروں پر لپکتی، ہرتی پھرتی، ہزاروں پاؤں کے مہم نشانوں سے بچی ہوئی افق کے دھند لکوں میں ڈوب جاتی ہیں۔ دراصل میں جس دیس کی باتیں کرتا ہوں وہ دیس تمہیں بھائے گا نہیں۔ لیکن کیا کیا جائے کہ یہ باتیں مجھے ضرور کہنی ہیں اور تمہیں ضرور سننی ہیں۔

وہ دیکھئے، وہ سامنے گاؤں کی تنگ گلی میں ایک چھوکری سر پر گھاس کا بہت بڑا گٹھا دھرے لڑکھڑاتی آ رہی ہے۔ یہ ایک کسان کی بیٹی ہے جس کی زمینیں قرق ہو چکی ہیں اور جو زمیندار کی ایک بیگمہ زمین کاشت کر کے اپنی بیوی بچی کا پیٹ پالتا ہے۔ چھوکری جوان ہے۔ چہرے پر سرخی ہے، مگر بے رونق سی، جیسے اینٹ جو دھوپ میں پڑے پڑے تپ گئی ہو۔ اس کے بالوں میں

بوڑھے بیلوں کا گوبر اٹھا کر چھت کی منڈیر پر تھوپے ہوئے اپلوں کی قطار سجائے گی۔ نیچے آکر بیلوں کے آگے خشک جوار کے آٹھ دس ٹانڈے پھینکے گی اور سر پر دو گائیں اور کولھے پر ایک گائے رکھ کر کنویں پر جائے گی اور راستے میں سوچے گی۔

”اری تو کس ماں باپ کے گھر پیدا ہوئی کہ تجھے سانس لینے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ کس گناہ کی پاداش میں تجھے دنیا کے اس دوزخ میں جھونکا جا رہا ہے۔ پر سوں مولوی وعظ میں کہہ رہا تھا کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں۔ اگر سب انسان بھائی بھائی ہیں تو زمیندار میرے باپ کو گھر کتا کیوں ہے، میرا باپ زمیندار کو کیوں نہیں گھرک سکتا۔ میرا باپ اسے اپنے گھر بلا کر اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کہ یہ کیوں نہیں کتا۔“ آج میری طبیعت کچھ ناساز سی ہے۔ جنگل میں جا کر خشک لکڑیوں کا ایک گٹھا لادے۔ اور دیکھو لکڑیاں پرانے مڑے کی ہڈیوں کی طرح خشک ہوں۔ اگر ذرا بھی گیلی ہوئیں تو سمجھو تیری قسمت پھوٹی۔“

آخر یہی الفاظ تو ہیں جو زمیندار میرے ابا کو کہا کرتا ہے۔ اور پھر اگر سب انسان بھائی بھائی ہیں، تو میں زمیندار کی بیٹی کو یہ کیوں نہیں کہہ سکتی۔

”اری ہاتھوں میں مندی پھر رچائیو۔ اور آنکھوں میں کاجل بھی بعد ہی میں لگا لیجو۔ یوں کرو کہ یہ تین گائیں اٹھالو اور لپک کر کنویں سے ٹھنڈا پانی بھر لاؤ۔ میں نہاؤں گی۔ اور دیکھو اگر کوئی گائے رستے میں ٹوٹی تو سمجھو تمہاری قسمت پھوٹی۔“

جاتے جاتے ہنس پڑے گی اور سوچے گی۔ ”بھئی بہت لطف آئے۔ بڑا مزہ آئے۔ وہ باہر نکلے تو لڑکے اسے چھیڑیں اور اس کے عجیب عجیب نام رکھیں۔ ”گھری، دھڑ کلا دم سنہری!“ چھپکلی نازوں سے پٹی!“ ”مسمی بلی“ چہرے پر مونچھیں آنکھوں میں جھلی!“ پھر کوئی ادھر سے کنکر اٹھا کر ”کٹاک“ سے گائے پر پھینک دے! اور پھر لطف آ جائے، اس کے رونے کا، بھیگ جائے۔ ٹوٹی

ہوئی گائے کے سامنے گھٹنوں میں منہ چھپا کر بیٹھ جائے اور بسورنے لگے۔ اتنی روئے کہ اس کی ناک پکی مرچ کی طرح لال پڑ جائے، گال شلغم کی طرح ابھر آئیں اور آنکھیں گائے کی ٹھکیریاں بن جائیں۔ واپس آئے تو میں برس پڑوں۔ ”اری مونڈی کاٹی! اے کنوارے بچے میں چھو کروں سے گائے کو نشانہ بنواتی پھرتی ہے۔ اے تیرے لکھ کس نہ جاگیں، کیا یونہی پانی بھرا جاتا ہے۔ اگر روز ایک گائے ٹوٹی تو سمجھو تمہاری قسمت پھوٹی!“

وہ مسکرائے گی۔ وہ مسکراہٹ جو اس کا خاصہ بن چکی ہے۔ واپس آکر گیلے ٹانڈوں میں پڑوس سے لائے ہوئے انگارے رکھ کر پھونکیں مارے گی اور اتنی دیر تک پھونکیں مارے گی کہ سائے ڈھل جائیں گے۔ اس کا سینہ ابھرے گا۔ اور بیٹھ جائے گا۔ اس کے گلابی نتھنے لرزے اور اس کے گال تھمتھانے لگیں گے۔ اس کی آنکھیں راکھ اور دھوئیں اور تھکن سے پتھرا سی جائیں گی! اور باجرے کی دو موٹی موٹی روٹیاں پکا کر اور چھاچھ کا ایک پیالہ بھر کر بوڑھی ماں کے آگے رکھ دے گی۔ چھاچھ کے برتن پر موٹی روٹی رکھ کر اور اپنی پھٹی چادر سے ڈھانپ کر باہر کھیتوں میں اپنے باپ کے پاس چل دے گی، جو اسے دیکھ کر کہے گا۔ ”آگنی میری بچی۔ بچی، آج کتنی دھوپ ہے۔ آج تو جیسے زمین کے نیچے تور سلگ رہے ہیں۔ اور بچی، تیرے جوتوں کے چیتھیرے تو شاید رستے ہی میں گر گئے۔ کوئی اور چیتھیرا ڈال لے، لے یہ میری پھٹی ہوئی پگڑی کا پلو۔ لے، اور بچی۔ آج تو نے منہ کیوں نہیں دھویا۔ دیکھ تو گرد سے تیرا سارا چہرہ اٹ رہا ہے۔ تو ہمیشہ کھوئی کھوئی سی رہتی ہے بچی۔ تو کھوئی کھوئی نہ رہا کر۔ میں بوڑھا تیرے سارے ہی توجی رہا ہوں۔ تیرے بل پر تو میں اس دوزخ میں اڑا پھرتا ہوں۔ ورنہ میری بچی میرے پاؤں کے تلوے تو کب کے قبر کی سردتہ کو چھو رہے ہیں!“ اور وہ کہے گی۔ ”ابا دراصل مجھے بھیا بہت یاد آتے ہیں۔ وہ اگر زندہ ہوتے تو آج بڑے بانکے جوان ہوتے۔ ہیں نا

ابا؟ سوچتی ہوں نہ ریل بنتی نہ وہ پیوں کے نیچے آتے۔ اور ابا کیا بھیا پھر واپس نہ آئیں گے۔“

اور اس کا ابا کہے گا۔ ”اری“ اگر مرنے والے واپس آ سکتے تو خدا کو کون مانتا۔“ — وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی پوچھے گی۔ صرف اس لئے کہ وہ ان باتوں تلے اپنی وہ آگ چھپائے گی جو اس کے جوان سینے میں دھک رہی ہے۔ وہ سلگتی ہوئی بھٹی جس کی لپٹیں اسے اپنی لپیٹ میں لے کر انگارہ بنا ڈالتی ہیں۔ اور وہ اکثر سوچا کرتی ہے کہ ”کئی لکڑیوں کے انگارے پڑے پڑے راکھ بن جاتے ہیں۔ اور کئی لکڑیوں کے انگارے پڑے پڑے پھوٹ پڑتے ہیں اور آس پاس بیٹھنے والوں کے ریشمی لباسوں میں کالے کالے سوراخ ڈال دیتے ہیں۔“ — انگارے کبھی کبھی پھوٹ بھی پڑتے ہیں!“ — انگاروں کے پھوٹنے کا خیال اس کا بہت بڑا سارا ہے، وہ سوچا کرتی ہے کہ جس طرح پل پل اور گھڑی گھڑی اس کی قسمت پھوٹی ہے، اسی طرح کبھی — ایک بار — صرف ایک بار یہ کنوارا انگارہ پھوٹے تو کیا لطف آئے۔ سوراخ ڈال دے آس پاس بیٹھنے والوں کے ریشمی لباسوں میں اور پھر چاہے ننھی چنگاریاں بن کر ان کے جوتوں تلے مسلا جائے۔

خالی برتن اٹھا کر واپس گھر آئے گی۔ ماں کی مٹھی چابی کے بعد وہ درانتی اور رسی اٹھا کر پھر جنگل کا رستہ لے گی بہت دیر تک تھکا تھکا گھاس کا نتی پھرے گی۔ اور جب شفق مغربی پر بتوں پر گلاب کے پھول بکھیر دے گی اور جب قدرت کا ہاتھ اندھیرے آسمان پر سنہری خاک چھڑک دیگا تو وہ اپنی قسمت کی سی آڑی ترچھی پگڈنڈیوں پر تیز تیز قدم اٹھاتی گھر آئے گی۔ اس کا بوڑھا باپ گیلے ٹائٹوں میں پھونکنیں مار مار کر روٹیاں پکا رہا ہو گا۔ دو لقمے زہر مار کر کے اٹھے گی تو اس کی ماں کہے گی۔ ”اری جلدی جلدی لوٹا کر۔ تو تو جہاں جاتی ہے وہیں کی ہو رہتی ہے۔ کنواری لڑکیاں راتوں کو بہت دیر تک باہر نہیں رہا کرتیں، پگلی۔“

آسمان ٹوٹ پڑتا ہے۔“ اور اس کا باپ کہے گا۔ ”ہاں میری بچی جلدی آ جایا کر۔ لیکن آخر تو کیسے جلدی واپس آئے گی، گوت بھی تو تو ہی کرتی ہے اور بھوسہ بھی تو ہی چھانتی ہے۔ راستہ دیکھ کر چلا کر بیٹی۔ سانپ بچھو کی رت ہے۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے گی اور سر پر گٹھارکھ کر زمیندار کی ڈیوڑھی کا رخ کرے گی اور جب چاند پر بت کے کسی غار سے ابھرے گا، اور سانپ ہسٹائیں گے، جب ٹھنڈی ہوا بوڑھے درختوں میں خوفناک گیت گائے گی اور بچھو اپنے ڈنک تولے پگڈنڈیوں پر بیٹھ جائیں گے، تو یہ واپس آئے گی۔ پریشان بال، سرخ گال، بھگی پلکیں، ڈھلکا دوپٹہ، مسکا چولا، گرم سینہ، ٹھنڈی انگلیاں اور ڈھیلی باہیں۔ آنکھوں میں سلگتی رت اور سینے میں گرجتی بجلیاں۔ قدم قدم پر یہ باتیں اس کے کانوں میں زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی طرح گھسیں گی اور اس کی چال میں میسارانہ شان پیدا کر دیں گی۔

آگنی تو؟ آج پھر تو نے منہ ہاتھ نہیں دھوئے! اری میرا کما مان لے۔ بن ٹھن کر رہا کر اور گھاس کاٹنے کے لئے اس بوڑھے خچر کو بھیج دیا کر۔ ابھی خاصہ ٹگڑا ہے اور اس بوڑھیا کو کھٹ سے کھینچ کر چولھے کے قریب بٹھا دیا کر، تاکہ اپنا کھانا خود پکا لے اور تو شام ہوتے ہی ادھر آ جایا کر۔ اری تو تو اپنی جوانی برباد کر رہی ہے۔ تو تو شراب کو گھورے پر ڈال رہی ہے پگلی۔ تو تو سونے کی ڈلیاں دلدل میں پھینکے جا رہی ہے دیوانی! اری بھولی۔ تیری یہ کافر جوانی، اور پھر یہ اپنے اور گیلے ٹائٹوں اور کھردری گھاس اور — یہ — یہ پھٹے ہوئے جوتے، اور یہ چولا — دیکھ تو تیری چھاتیاں اور تیرا پیٹ اور تیری باہیں — سب کچھ تو نظر آ رہا ہے — اس سے بہتر ہے کہ کپڑے اتار کر تنگی چلا پھرا کر۔ تف ہے! میں کتا ہوں تو مجھ سے ریشم کے انبار لے۔ سونے کے زیور لے۔ مخلی جوتے لے۔ جو کچھ تو چاہتی ہے میں تجھے لادوں گا۔ پر خدا کے لئے اپنی حالت سنبھال۔ تو نئی نئی کلی ہے اور اپنے ہی بوجھ سے زمین کی

طرف جھکی جا رہی ہے۔ زمین گرم ہے اور تو مجلس جائے گی۔ پھر مجھ پر الزام نہ دھرو۔“

اور پھر اس کی اپنی آواز۔ ”زمیندار جی۔ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“ آپ میری جوانی چاہتے ہیں نا۔ لے لیجئے میری جوانی اور مجھے رخصت کیجئے کہ میرے بوڑھے ماں باپ پڑے کراہ رہے ہوں گے۔ آپکی یہ مہربانی کیا کم ہے کہ شام کی اس ذرا سی روحانی اور جسمانی محنت کا صلہ آپ یوں دے رہے ہیں کہ میرے بوڑھے باپ کو ایک بیگہ زمین کاشت کے لئے دے رکھی ہے۔ جلدی کیجئے مجھے جانا ہے۔“

”اری تو تو پگی ہے۔ دیوانی۔ پھول اور کڑوی خوشبوئیں پھیلائے۔ پگی! اور تیرا یہ جسم کیوں جل رہا ہے؟“ اور پھر اس کے گالوں پر انگلیاں کھینچنے لگیں گی۔ اس کی باہوں پر ہاتھ پھرنے لگیں گے جیسے سانپ ڈسنے کے لئے کوئی نرم جگہ تلاش کر رہے ہیں اور اس کے بعد اس کا دل قیامت خیز رفتار سے دھڑکے گا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اپنے گھر آئے گی اور کھاٹ پر بے جان لو تھڑے کی طرح گر جائے گی۔ اس کے ماں باپ پوچھیں گے۔ ”اتنی دیر کیوں لگا دی تو نے؟“

اور وہ کہے گی۔ ”زمیندار کے مہمان آ گئے تھے۔ گھوڑوں کے آگے چارہ ڈالنا پڑ گیا۔“

اور اچانک اسے اپنا سارا وجود ایک انگارے کی شکل اختیار کرتا محسوس ہو گا اور وہ سوچے گی کہ یہ انگارہ کب پھوٹے گا۔ کب پھوٹے گا یہ انگارہ کہ میں چنگاریاں بن کر ان زمینداروں، ان مولویوں اور پیروں کے ریشمی، ملبوس میں کالے کالے سوراخ ڈال دوں۔ ان کے دیدوں میں گھس جاؤں، ان کی کنپٹیوں سے چمٹ جاؤں! صبح تک یہ انگارہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ وہ پھراٹھے گی۔ وہی گھاس کا گٹھا ہو گا، اور وہی جوتوں کے چیتھیروں کی آڑی

سیدھی لکیر۔۔۔ وہی پھٹا ہوا چولا اور وہی جھلکتی ہوئی چھاتیاں! یہ انگارہ یوں ہی تپے گا۔ ٹھنڈا ہو گا۔ تپے گا۔ ٹھنڈا ہو گا اور زمیندار کے شہستان میں اسی طرح۔۔۔ تم انگڑائیاں لے رہے ہو، شاید تھک گئے ہو یہ متعفن باتیں سن کر! اچھا۔۔۔

☆

جوانی کا جنازہ

گاؤں کے پچھم کی طرف پہاڑیوں کی ابھرتی اور پھیلتی ہوئی قطاروں کی دھندلی چوٹیوں پر وہ بھیڑیں چرایا کرتا تھا۔ طلوع آفتاب کے ساتھ ہی وہ تنگ اور ٹیڑھی گلیوں میں سے بھیڑیں ہٹاتے نکلتا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بنسری ہوتی اور دوسرے میں ایک پوٹلی، جس میں گزشتہ شام کی دو روٹیاں اور ایک موٹی سی پیاز ہوتی۔ پتلی پتلی پتھریلی پگڈنڈیوں پر زیر لب گنگنا تا، ست رفتار بھیڑوں کو ایک قطار میں چلنے کے لئے احکام صادر کرتا، وہ اوپر ہی اوپر چڑھتا جاتا اور جب مشرقی افق پر سورج نیزہ بھر بلند ہو جاتا اور بہت دور نیچے گاؤں کی چھتوں پر بہت دیر تک سونے والے گبرو کروٹیں بدل کر اٹھ بیٹھتے، تو وہ ایک خاص چوٹی پر پہنچ جاتا۔ بھیڑیں ادھر ادھر بکھر جاتیں اور وہ لابی گھاس کے لہراتے اور جھومتے ہوئے پودوں میں ایک پتھر اور اپنی گپڑی کا تکیہ بنا کر لیٹ جاتا اور بنسری سے ایسے ایسے سریلے سر نکالتا کہ بہت پرے ڈھلانوں پر بکھرے ہوئے جھوپڑوں کے ڈھانوں میں رنگ برنگی اوڑھنیاں پھڑپھڑانے لگتیں اور ریلی تانیں دیر تک نشیب و فراز میں گھومتی رہتیں۔ نیلے آسمان پر اڑتے ہوئے بادل تھم جاتے اور سورج کی تیز شعاعیں تھر تھر لڑتی موسیقی کے نشے میں جیسے لڑکھڑانے لگتیں۔

دوپہر کو وہ نیچے ایک جھرنے پر چلا جاتا۔ باسی روٹیوں اور پیاز کو جھرنے

کے شفاف پانی کی مدد سے حلق کے نیچے اتارتا۔ بھیڑیں دھوپ سے گھبرا کر آس پاس جھاڑیوں کے تلے جمع ہو کر چھدری چھاؤں کی پناہ لینے لگتیں اور وہ وہیں جھرنے کے کنارے ایک سفید، ٹھنڈی اور چوڑی چٹان پر لیٹ جاتا اور بہت دیر تک سویا رہتا۔ یہ جھرنہ ایک گہری کھاڑی میں تھا۔ اس لئے یہاں دھوپ بہت کم آتی۔ شام سے چند لمحے پہلے اٹھتا اور پھر وہیں منہ ہاتھ دھو کر بنسری سنبھالتا اور بھیڑیں ہٹاتے واپس گاؤں آ جاتا۔

یہی اس کا معمول تھا اور یہی اس کی زندگی۔ اس کی مثال بالکل اس دربان ایسی تھی جو ایک طویل و عریض محل کی ایک بہت لمبی غلام گردش میں صبح سے شام تک ٹھٹھاتا رہتا ہو اور پھر اپنے گھر جا کر صبح کے انتظار میں سو رہتا ہو۔

اور پھر ایک روز کا ذکر ہے کہ اس غلام گردش کی دونوں طرف کی سنگین دیواروں میں دو چار ننھی ننھی کھڑکیاں سی پیدا ہو گئیں۔ بھیڑیں آگے لگائے جب پگھٹ کے قریب سے گذرا جو اس کی راہ میں پڑتا تھا تو اسے وہاں ایک لڑکی دو بھری ہوئی گاگریں سامنے رکھے حیران و پریشان ادھر ادھر دیکھتی نظر آئی۔ روزانہ سینکڑوں لڑکیاں اسے پگھٹ پر نظر آتی تھیں اور اس کے خیال میں ان لڑکیوں کا مصرف صرف یہ تھا کہ پانی بھریں، روٹیاں پکائیں، باہر کھیتوں میں اپنے بھائیوں کو کھانا پہنچا آئیں، باجرے کی فصل سے چڑیاں اڑنے کیلئے دن دن بھر کھڑی دھوپ میں سڑتی رہیں اور پھر جب ان کے والدین کے پاس کچھ رقم اکٹھی ہو جائے یا مہربان صاحبان قرضہ دینے پر رضامندی ظاہر کرے تو ان کا بیاہ ہو جائے اور وہ کسی اور گھر میں جا کر اپنے فرائض کی بجا آوری میں مصروف ہو جائیں! اس نے سوچا، شاید یہ لڑکی اپنی کسی سہیلی کے انتظار میں کھڑی ہے اور سہیلی شاید ابھی تک دودھ بلو رہی ہو گی۔ یاد ہی دیر میں جما ہو گا۔ یا شاید وہ بکریاں دودھ رہی ہو گی۔ کیونکہ بکریاں باہر جانے سے بس ایک دو لمحے پیٹھری دیتی ہیں تاکہ دودھ کا ایک حقیر سا قطرہ بھی ان کے تھنوں

میں نہ رہنے پائے۔ اسی لئے صبح کو گھروں سے نکلی ہوئی بکریوں کے تھن پرانے چیتھڑوں کی طرح لٹکتے نظر آتے ہیں! یہی باتیں سوچتا جا رہا تھا کہ لڑکی کی آواز آئی۔ ”اے بھائی۔ ذرا یہ دو گاگریں تو رکھ دے میرے سر پر!“

اس نے سوچا۔ یہ عجیب لڑکی ہے کہ دو گاگریں زمین سے اٹھا کر سر پر نہیں رکھ سکتی۔ پہلے ایک گاگر سر پر دھر لے۔ پھر جھک کر دوسری کو کولھے پر نکائے اور گھر چلی جائے۔ آگے رستے میں کھیت پڑتے ہیں۔ بھیڑوں نے ادھر کا رخ کر لیا تو فساد ہو جائے گا کھیتوں کے رکھوالے سے۔ پچھلے دنوں بھی وہ گلیوں میں بڑبڑاتا پھرتا تھا کہ غوث ہر اس کھیت میں بھیڑیں ہانک دیتا ہے جو پگڈنڈی کے آس پاس لہلہا رہے ہوں!

”اے بھائی سنتے ہو؟ یہ دو گاگریں۔“

اور غوث پلٹ کر بولا۔ ”اچھا اچھا۔“

آگے بڑھ کر اس نے ایک گاگر اٹھائی اور اس کے سر پر دھردی۔ بوجھ کی وجہ سے اس کی گردن کی رگیں تن گئیں اور گالوں پر ہلکا گلابی پینہ پھوٹ نکلا۔ ”بڑی کمزور چھو کری ہے۔“ اس نے سوچا۔ ”اس عمر کی لڑکیوں کو میں نے تین تین گاگریں اٹھا کر گھوڑی کی طرح دوڑتے دیکھا ہے۔ اس کے سر پر دوسری گاگر رکھ دی گئی تو بیٹھ جائے گی بزدل اونٹنی کی طرح!“

مسکرا کر بولا۔ ”پہلی گاگر ہی نے تیرے ہوش اڑا دیئے ہیں۔ اب اس دوسری گاگر سے تیرا دم ہی نہ نکل جائے۔“

اور وہ شرما کر بولی۔ ”میں بیمار ہوں بھئی۔ مجھے دس روز سے بخار آتا ہے، پر اٹھالے جاؤں گی۔ لے اب اٹھا دو سری گاگر۔ وہ دیکھ تیری بھیڑیں عطا کے کھیتوں میں گھس گئی ہیں!“

بھیڑیں سرسبز کھیتوں میں گھس کر مزے سے چر رہی تھیں اور پرلی طرف پہاڑی پر سے خوفناک گالیوں کا ایک گرجتا ہوا سیلاب اٹھ رہا تھا! گھبراہٹ

میں غوث نے گاگر پکڑ کر اوپر اٹھائی تو گاگر کی چکنی سطح پر اس کی انگلیاں نہ جم سکیں۔ وہ اس کے ہاتھوں سے پھسل کر لڑکی کے پاؤں پر جاگری اور خون کی ایک پتلی سی دھار اس کے انگوٹھے سے نکل کر پگھٹ کے پانی میں گھلنے لگی!

”واہ رے گہرو۔“ وہ آنکھیں میکا کر بولی۔ ”تو تو غلاموں کہمار سے بھی زیادہ نالائق نکلا۔ گاگر بھی تو زدی، پاؤں بھی زخمی کر دیا اور کھڑا مجھے پنگوں کی طرح گھور بھی رہا ہے پگلا!“

اور غوث دبے پاؤں پگھٹ سے ہٹ کر پگڈنڈی پر آگیا اور بھیڑوں کو کھیتوں سے نکلنے کے لئے بگٹ دوڑا۔ ادھر سے کھیتوں کا رکھوالا بھی پہاڑی پر سے نہایت تیزی سے اترا آ رہا تھا اور بھیڑیں مزے سے چڑچڑ رہی تھیں!

کھیت کے قریب جا کر اس نے دو چار پتھر اٹھائے اور بھیڑوں پر پھینکے، بھیڑیں تڑپتڑپ کر ادھر ادھر دوڑ گئیں اور پھر پگڈنڈی پر آنکھی ہر کر ایک دوسرے سے لگ کر یوں چلنے لگیں جیسے اون کا بہت بڑا ذخیرہ آپ ہی آپ کنکروں پر اوپر کی طرف کھسکا جا رہا ہو۔ پلٹ کر غوث نے پگڈنڈی کا رخ کیا ہی تھا کہ کھیتوں کے رکھوالے عطا نے زور سے ہانک لگائی۔ ”ابے کہاں تک جائے گا تو مجھ سے بچ کر؟ کیمنے۔ یہ تیرے باوا کے کھیت ہیں کہ تو اپنی ماؤں کو ادھر بھیج دیتا ہے؟“

غوث تو جہاں تھا وہیں کھڑا کھڑا رہ گیا۔ گاؤں کے اتنے گراںڈیل گہرو کو یہ ہڈیوں کی مٹھی عطا یوں گھرک دے۔ گرج اٹھا۔ ”منہ سنبھال کر بات کر عطا ورنہ لٹا دوں گا۔“ تختے کی طرح۔ حیوان تیرے میرے کھیت کو کیا جانے۔ دو چار تنکے چر لئے انہوں نے تو قیامت نہیں ٹوٹ پڑی۔ اس کے بدلے شام کو میرے گھر آ کر ایک سیر آٹا لے جانا۔“

عطا جو پہلے ہی ہانپ رہا تھا، بے دم ہو کر بولا۔ ”ابے کیا میں نکو گدا ہوں کہ تیرے گھر آ کر آٹے کی بھیک مانگوں۔ بھرے گھر میں اناج کے دو

دانے نہیں اور نواب صاحب مجھے بھیک دے رہے ہیں۔ ابے تیرے ایسے تو بیسیوں کتے میرے گھر کی دہلیز چاٹتے پھر رہے ہیں۔ اگر پھر کبھی تیری ان ماؤں میں سے ایک بھی —

غونٹ نے غضبناک ہو کر ایک پتھر اٹھایا اور تراخ سے عطا کے گلے پر دے مارا۔ یوں آواز پیدا ہوئی جیسے کسی کتے نے کوئی بہت مضبوط ہڈی توڑی ہے۔ عطا کے کپڑے خون سے لت پت ہو گئے۔ چوٹ کی شدت سے لڑکھڑا جانے کے بہانے سے اس نے تیزی سے ایک پتھر اٹھایا اور گھما کر غونٹ کی طرح پھینکا جو پینتر بدل کر ایک طرف کود گیا اور پتھر سیدھا ریگتی ہوئی بھیڑوں میں گرا جو ”آ آ آ“ پکارتیں آس پاس ڈھیروں پر چڑھ کر نتھنے پھڑکانے لگیں۔

غونٹ، جواب دونوں ہاتھوں میں تکیے پتھر اٹھائے ہوئے تھا، عطا کو ڈپٹ کو بولا۔ ”دیکھ چھو کرے۔ اگر تو نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو سمجھ لے کہ تیری موت کے اس فرشتے نے تیری کپٹی ادھیڑ کر رکھ دی۔“

اور اس نے پتھر کو ہوا میں اچھالا۔ ”پلٹ کر وہاں پہاڑی پر چڑھ جا اور کھیتوں کی رکھوالی کر۔ شیر کی مونچھ کترنا آسان نہیں، سمجھے؟ تیری ان شعلے برساتی ہوئی آنکھوں سے غلاموں کھار ہی خوف کھائے تو کھائے۔ گاؤں کا کوئی اور گہرو تو تجھے اپنے نتھنے کا بال بھی نہیں سمجھتا۔“

اور یہ کہہ کر جیسے غونٹ نے لٹروں کا وہ ہار جو پگھٹ والی چھو کری نے اس کے گلے میں ڈال دیا تھا، اتار کر عطا کے منہ پر دے مارا۔

عطا پلٹ کر جاتے ہوئے بولا۔ ”سمجھ لوں گا تجھ سے، سمجھ لوں گا۔“
”کیا سمجھے گا؟“ غونٹ پگڈنڈی کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ”چھپکلی اگر اڑدھے کو دھمکی دے تو اڑدھے کا کیا بگڑ جائے گا۔“

”خیر سمجھ لوں گا۔“ عطا بولا۔ اور جب غونٹ آس پاس بکھری ہوئی بھیڑیں اکٹھی کر رہا تھا اور عطا پہاڑ کے دامن میں پہنچ چکا تھا تو اس نے غونٹ کو

ایسی گونجیلی اور فولادی گالی دی کہ پہاڑیاں بجنے لگیں۔ جیسے تانبے کی چادروں پر ایک دم پتھروں کا مینہ برس پڑے۔ غونٹ نے گھوم کر عطا کی طرف دیکھا اور پھر اس زور سے قہقہہ لگایا کہ تانبے کی چادروں پر پتھروں کی ایک بار پھر موسلا دھار بارش ہو گئی۔ گالی کا جواب قہقہہ! یہ اس کے نزدیک سب سے بڑی گالی تھی!

اور جب وہ گھاس سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں پر پہنچا تو حسب معمول پتھر اور پگڑی کا تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔ بنری لیوں سے لگائی۔ اس کی سانس غیر ارادی طور پر بنری سے چیخ بن کر نکلتی آس پاس غھسیوں میں ڈوب گئی اور غونٹ نے محسوس کیا جیسے اس چیخ میں کسی کی آواز آئی ہے۔ ”غلاموں کھار۔“

سننے کے اندر چڑچڑ سی ہونے لگی جیسے کوئی کباب بھون رہا ہو انگاروں پر — ایک بھیڑ کے بچے کو گود میں اٹھا کر اس کے بالوں میں منہ گھسیڑے بہت دیر تک سوچتا رہا۔ ”ارے وہ غلاموں کھار جس کی ایک آنکھ پچک کر خدا جانے کہاں گم ہو گئی ہے اور جس کے سامنے کے چار دانت مدت سے غائب ہیں! ارے وہی غلیظ غلاموں جو مجھے ملتا ہے اور میرے گھٹنوں کو چھوتا ہے، تو مجھے اس سے گھن سی آنے لگتی ہے! وہ کبجنت جس نے ایک بار اپنے تازہ ہتازہ تیار کئے ہوئے گیلے گھڑے پر بیٹھے ہوئے کوئے کو پکڑ کر اس کی گردن کو دھنکوں سے چبا ڈالا تھا! ارے وہی غلاموں کھار —“

اور پھر بھیڑ کو گود سے اتار کر اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔
”آنکھیں، ناک، لب، سینہ، باہیں، پنڈلیاں۔ سب کو ٹولا۔ اور پھر اکڑ کر بولا۔
”کہاں غونٹ کہاں غلاموں کھار — کہاں راجہ بھوج کہاں گنگو اتلی —
لڑکی نے مجھے اچھی طرح نہیں پہچانا!“

پتھر اور پگڑی کا تکیہ بنا کر وہ پھر لانی گھاس میں لیٹ گیا۔ جو نی بنری سے ایک دو سر نکالے تو اسے محسوس ہوا جیسے ہر طرف ان دھکی روہیں چیخ چیخ

تپ کر پٹننے کی حد تک پہنچ گیا اور پھر وہ ایک جھرنے سے دوسرے جھرنے تک، دوسرے جھرنے سے اوپر چوٹی کی جھاڑیوں کے پاس — جھاڑیوں سے دور اندھیری کھاڑیوں میں گول مول پتھروں کے انبار کے قریب — وہ گھومتا پھرا۔ اور جب سورج پچھم کے پہاڑوں پر سرسوں سی بکھیرنے لگا تو وہ گاؤں کو پلٹا۔ پگھٹ کے قریب پہنچا تو ادھر سے غلاموں کھار دو گدھے ہانکے آ رہا تھا۔ جان بوجھ کر غوث نے اس کے قریب سے گزر کر اس کے شانے سے شانہ بھڑا دیا اور پھر کڑک کر بولا۔ ”اے اندھا ہے تو۔ ابھی ایک آنکھ تو سلامت ہے تیری۔ راہ دیکھ کر نہیں چلتا؟“ اور غلاموں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”غلطی ہو گئی ملک۔ بھول ہو گئی۔ بخش دے۔“

”کیونہ!“ غوث نے جیسے دماغ میں سے بھاری لوہا اور رگوں میں سے بالوں بھرے کیڑوں کو گیسٹ کر پرے پٹخ ڈالا ہے! پنہاریاں ایک دوسرے سے پوچھنے لگیں۔ ”اری کون ہے یہ؟“ غوث ہے نا، محبت خان کا لڑکا!“ — ”بڑی آگ ہے اس میں“ — اور ایک بڑھیا نے اپنے سن کی رعایت سے ایک جھوٹ تول دیا۔ ”بڑا جیلا چھو کر ہے“ غلاموں کی موت آئی تھی کہ اس کی راہ میں آگیا۔ سنا ہے اس نے پرسوں ایک بیل کے گھونسا مارا اور وہ زمین پر بچھ گیا۔ ٹانگ تک نہ کھینچی کبخت نے!“ — اور ادھر سے ایک اور ادھیڑ عمر کی پنہاری بولی۔ ”اری یہی تو ہے جس نے عطا کا کلا دھن دیا ہے آج!“

سب لڑکیاں دانتوں تلے انگلی دبائے بہت دیر تک غوث کو دیکھتی رہیں جواب نہایت تیزی سے گلی کا موڑ کاٹ رہا تھا!

اور غوث سوچتا جا رہا تھا ”اس چھوکری کو کتنی غلطی ہوئی ہے۔ شاید غلاموں کھار کا لفظ یونہی بے مطلب اس کے لبوں سے ٹپک پڑا تھا۔ وہ اگر اب یہاں پگھٹ پر ہوتی اور میری گرج سنتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ غوث کوئی معمولی دل گردے والا نوجوان نہیں“ — اس نے کانڈھے جھٹکا کر سینہ تان

کر ”غلاموں غلاموں“ پکار رہی ہیں۔ ہنسی کو زور سے زمین پر پٹخ دیا اور سینے کو بے تابانہ ملتے ہوئے بولا۔ ”اونہ!“

”غلاموں تو چوٹا ہے میرے سامنے۔ یوں چنگی میں مسل دوں! میں نے عطا ایسے اکڑے ہوئے نوجوان کو دم لگا دی۔ غلاموں بے چارہ تو میری اس ہتھکلیا کی مار ہے!“

مگر اس کی رگ رگ میں جیسے پھول بھرے کیرے رنگ رہے تھے۔ اس روز وہ جھرنے کے کنارے چوڑی چٹان پر کھانا کھانے بیٹھا تو ایک ایکی اسے خیال آیا۔ ”یہ اتنی بڑی پیاز ہے۔ اچھے اچھے پنہوان اسے دو ہتھیلیوں میں رکھ کر نہ توڑ سکیں اور میں — میں —“ اور اس نے پیاز کو ہتھیلیوں میں جما کر دبایا۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں جکڑ لیا اور پھر کڑوے لعاب کی ایک دھار، چوڑی چٹان پر ریگتی جھرنے میں گرنے لگی۔ غوث نے جب اپنی گرفت ڈھیلی کی تو پیاز بھوسہ بن چکی تھی۔ اس نے بہت زور کا قہقہہ لگایا اور پھر روٹیوں کو وحشیوں کی طرح نکلنے لگا۔ اوپر سے جھرنے کا پانی پینے کے لئے جھکا ہی تھا کہ اسے جھرنے کے آئینے میں اپنا چہرہ نظر آگیا۔ موٹی موٹی آنکھیں۔ منہ منہی مونچھیں۔ لال رنگ۔ لہراتے بال — اس نے مسکرانے کے لئے اپنے لبوں کو جنبش دی ہی تھی کہ ایک بڑا سا مینڈک لپکا اور جھرنے میں کود کر — کی طرف تیر گیا۔ سطح پر منہی منہی لہروں کا جال سا بچھ گیا اور غوث نے اپنے سلوٹیں پڑے عکس کو دیکھ کر یوں محسوس کیا جیسے یہ مینڈک غلاموں کھار تھا جس نے اس کے چہرے پر دنیا جہان کی لعنتیں چپکا دیں! مینڈک کو پکڑنے کیلئے وہ جھرنے میں کود گیا۔ نہ پر بیٹھی ہوئی مٹی نے ادھر ادھر ابھر کر سارے پانی کو گدلا کر دیا اور مینڈکوں کا ایک غول اپنی لمبی لمبی ٹانگیں پھیلاتا — کسی نامعلوم — کی طرف لپک گیا۔

اس روحانی کرب سے اس کے دماغ میں جیسے لوہے کا بہت بھاری ٹکڑا

لیا اور جب گھر آیا تو خلاف معمول تن کر چلنے سے اس کی کردکھ رہی تھی! رات بھر وہ یہی سوچتا رہا کہ کاش وہ لڑکی وہاں پگھٹ پر موجود ہوتی اور پھر گاگر ٹوٹ گئی تو میرا کیا قصور تھا۔ خود گاگر کے پیندے پر سبز چکنائٹ لپٹی ہوئی تھی۔ اس پر تو رستم کا ہاتھ بھی نہ جم سکتا۔ سارے گاؤں میں کسی کو خاطر میں نہ لانے والا اب اس کے سامنے آنکھیں تک نہ اٹھا سکے گا۔ اس کے نزدیک تو میں — میں — اور ساری دنیا کے بزدل جانور اس کے سامنے آئے اور میں ہلاتے کہیں غائب ہو گئے۔

اور جب صبح اٹھ کر اس نے باڑے سے بھیڑیں نکالیں اور پگھٹ کے پاس سے گزرا تو وہی لڑکی اسی حالت میں کھڑی نظر آئی۔ غوث کو دیکھ کر اس نے منہ پھیر لیا اور کسی اور راہ چلتے کے انتظار میں دوسری طرف دیکھنے لگی کہ اچانک غوث اس کے قریب آگیا۔ ”لاؤ میں گاگریں سر پر رکھ دوں۔“ اور وہ تن کر چلی۔ ”میں اپنی گاگروں کی دشمن ہوں کیا۔ جا اپنی راہ لے۔“

غوث نے لجاجت سے کہا۔ ”اری تیری اس گاگر کے پیندے سے سبز چکنائٹ لپٹی ہوئی تھی۔ ورنہ میرا تجھ سے کون سا بید ہے۔ میں شرمندہ ہوں کہ تیری گاگر بھی توڑی۔ تیرا پاؤں بھی زخمی کیا اور تیری نفرت بھی مول لی۔ میں تو بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے پانچ پانچ من کے پتھر ایک ہاتھ پر اٹھا کر گھمائے ہیں اور کنکروں کی طرح پرے پھینک دیئے ہیں۔ یہ گاگر کیا چیز ہے میرے سامنے۔“

اور اس نے ایک گاگر اٹھا کر لڑکی کے سر پر دھردی اور دوسری کو کچھ اس انداز سے پہلی گاگر پر بنایا کہ کوئی آواز نہ آئی۔ لڑکی کے قدم تک نہ ڈمکائے لڑکی کو یوں محسوس ہوا جیسے اوپر سے کسی نے پھول پھینک دیا ہے۔ وہ مسکرائی۔ ”واہ رستم! آج تو غضب ڈھا دیا تو نے۔ گاگر رکھی بھی ہے سر پر؟“

مجھے تو کچھ پتہ نہیں چلا۔“

اور غوث کے ماتھے پر مسرت کا پسینہ پھوٹ نکلا۔ بولا۔ ”مجھے کل کی بات کے لئے معاف کرنا۔ دراصل اس گاگر کی قسمت ہی میں پھوٹا لکھا تھا ورنہ —“

”کوئی بات نہیں۔“ لڑکی نے جاتے ہوئے کہا۔ ”غلاموں کہنا زندہ ہے تو گاگروں کی کیا پروا ہے؟“ اور غوث کے دل کو جیسے کسی نے چنگی سے نوچ لیا ہے۔ گھبرا کر لڑکی کی طرف دیکھا جو کھلکھلا کر ہنس پڑی اور غوث بھی قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گیا۔ اور یونہی غیر محسوس طور پر غوث نے اس کے مسکراتے ہوئے لبوں کے گوشوں کی مبہم کپکپاہٹیں اپنی آنکھوں میں بسالیں اور پھر جب ادھر بھیڑوں کی طرف دیکھا تو وہ کل کی طرح کھیتوں میں مزے سے چر رہی تھیں۔ بھاگا بھاگا کھیت کے قریب پہنچا ہی تھا کہ چٹان کی آڑ سے عطا نے اٹھ کر اس پر پتھروں کا مینہ برسا دیا۔ اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے گھر کھاٹ پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے سر، باہوں، سینے اور پنڈلیوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھی اور چہرے پر صرف ہونٹ اور آنکھیں کھلی تھیں سب سے پہلے اس کے ذہن میں پتلے پتلے ہونٹوں کے نقوش ابھرے جن کے مبہم گوشے پھڑک رہے تھے اور پھر اسے عطا یاد آگیا اور پھر — پھر —!

”پھر کیا ہوا؟“ اس نے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں سے پوچھا۔ اور اس کی ماں جو پانقتی پر بیٹھی رو رہی تھی۔ بولی۔ ”کیا ہوا! کچھ نہیں ہوا! بس عطا نے اپنی موت کو بلایا ہے تو اچھا ہو لے میرے لال۔ پھر میرے پاس اس کے وہ ہاتھ کاٹ لانا جن سے اس نے تجھ پر پتھر پھینکے، میں انہیں بھون کر بلی کے آگے ڈال دوں گی۔ بیچاری کئی روز کی بھوکی ہے۔“

غوث نے پوچھا۔ ”لیکن مجھے وہاں سے اٹھا کر کون لایا۔“

اور اس کی ماں بولی۔ ”اس وقت شاید پگھٹ پر شریف خاں کی لڑکی

کچھ بھی نہ ہو تو کیا ہو۔ اس کے دماغ پر بے شمار لانتناہی تار پھیل گئے لیکن یہ تار شفاف تار تھے۔ کبھی کبھی وہ تاباں مستقبل کے سامنے آکر چاندنی کی کرنوں کی طرح جگمگاٹھتے اور کبھی مبہم سوچوں کے دھند لکوں میں لپٹ کر دھوئیں کی باریک دھاریاں بن جاتے۔ اس کی ماں اسے اکثر بتاتی کہ آج پھر مہتاب اپنی ماں سمیت اس کا حال پوچھنے آئی تھی۔ اور غوث کی نبضیں یوں دھڑکتیں جیسے اس کے زخموں کے کھرنڈ پر کوئی ہمدرد بیٹھا ٹھونگیں مار رہا ہو۔ ان تمام دنوں میں عطا اس کے ذہن پر بہت کم ابھرا۔ اور جب ابھرا تو اپنے لال لال دیدے پھیلاتا پھرا انہیں گرائیوں میں ڈوب گیا!

اور پھر ایک روز ایسا بھی آیا کہ جب مہتاب آئی تو وہ جاگ رہا تھا۔ کواڑ کو پار کر کے جب اس کی نظریں صحن میں گھومتی ہوئی دیوار تک پہنچیں تو اچانک اس کے زخموں پر وہی ان دیکھا ہمدرد چوہا تیز کرنے لگا! اس کی پتلیوں پر ایک آبی پردہ سا پھیل گیا اور پھر جب اس نے آنکھیں ملیں تو اسے مہتاب نظر آ گئی نیچی نظریں کئے۔ پاؤں کے انگوٹھے کے زخم پر تنکا پھیر رہی تھی۔ اور پھر جب اس کی پلکیں جنھوں نے اس کے گالوں پر سائے پھیلا رکھے تھے، انھیں تو غوث نے یوں محسوس کیا جیسے ساری کائنات اوپر ابھر کر فضاؤں میں معلق ہو گئی ہے! جیسے سپرے نے سانپوں بھرے پٹارے پر سے ڈھکنا اٹھا دیا ہے اور سانپ لہرا لہرا کر آس پاس ریختے پھر رہے ہیں۔ جیسے کسی تشنہ لب کی اوک میں کسی غیر محسوس ساقی نے آبِ دمِ دم کے ٹکے اندیل دئے ہیں! بہت سی باتیں اس کے ذہن میں آئیں۔ مہتاب کی پلکیں جھپک کر پھراٹھیں۔ ادھر ادھر گھوم کر اس کی نگاہیں غوث پر جم گئیں اور غوث نے اتنی طویل انگڑائی لی کہ اس کی چھاتی پر بندھی ہوئی پٹیاں ڈھیلی پڑ گئیں۔ اور پھر مہتاب جانے کے لئے اٹھی۔ اپنے پرانے میلے آنچل کو تان کر سینے پر پھیلاتی، بوسیدہ جوتے تھپتی، دو تین ہادر جھکی ہوئی لٹوں کو ادھر کانوں کے پیچھے جماتی، جب وہ غوث کی کوٹھڑی کے

مہتاب پانی بھر رہی تھی۔ تمہاری لڑائی کا شور سنا تو بھاگی بھاگی آئی اور سارے گاؤں کو اطلاع دی۔ خدا بھلا کرے بے چاری کا۔ ہم سب وہاں پہنچے تو تو پتھروں پر لہو لہان پڑا تھا۔ اور وہ شیطان کا بچہ عطا غائب تھا۔ ہم پر مہتاب نے احسان کیا ہے۔ بے چاری میرے پاس ابھی تک بیٹھی رہی۔ ماں بھی ساتھ تھی اس کے۔ اگر وہ ہمیں اطلاع نہ دیتی تو — تو — اور غوث کی ماں کی آواز بھرا گئی۔

غوث مسکرا کر بولا۔ ”تو گدھیں اور کوئے اور —“ وہ زور سے ہنسنے لگا۔ ”خیر دیکھا جائے گا۔ دیکھ لوں گا۔ اچھا!“ اور اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونا شروع ہو گئیں۔ اور جب ان کے پوری طرح بند ہونے میں صرف ایک ذرا سی جھپکی کا وقفہ تھا تو غوث مسکرانے لگا۔ اسے سامنے چھت پر مہتاب کے کپکپاتے ہوئے ہونٹ تیرتے نظر آئے اور پھر ان میں حرکت ہوئی۔ اور انہوں نے کہا —! یہ اس خواب کی ابتدا تھی جو شام تک سوتے ہوئے غوث کے خیالات پر منڈلاتا رہا۔ وہ خواب جس کے ختم ہو جانے پر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اسے دھچکا سا لگا۔ اور وہ چیخ کر بولا۔ ”مجھے سونے دو!“ اور آس پاس کھڑے ہوئے لوگ سرگوشیاں کرنے لگے۔ ”بے چارے کے دماغ پر اثر پڑا ہے“ اور پھر قریب ہی کھڑے ہوئے غلاموں کے ہمارے یہ بات چوپال پر جا کر کہہ دی کہ غوث کا دماغ چل گیا ہے، اور پھر گلی گلی یہی تذکرے ہونے لگے کہ ”غوث دیوانہ ہو گیا ہے۔ بے چارہ غوث!“

لیکن غوث دیوانہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے تو شعور اور احساس کے اس وسیع کُرے میں قدم دھرا تھا جہاں ہر طرف روشنیاں اور دھندلکے آپس میں لپٹے پڑتے تھے اور جہاں رات اور دن کے سکوت اور ہنگامے آپس میں دست و گریباں تھے۔ ہمارے ايام میں اس نے بہت سی باتیں سوچیں، بہت عجیب عجیب باتیں۔ اگر یوں نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ اگر یوں ہو جائے تو کیا ہو جائے۔ اگر

سامنے سے گزری تو غوث نے اپنے شک گلے سے ایک کھڑکھڑاتی ہوئی آواز نکالی۔ ”اچھی ہو متاب؟“ متاب ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی اور پھر گھوم کر ایک طرف ہو گئی اور ایک انگلی کے ناخن کو اپنے دانتوں سے جیسے کترنے لگی۔ متاب کی ماں اندر غوث کے پاس آ گئی۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کی ماں کو مخاطب کرتی ہوئی بولی۔ ”لے“ اب تو اچھا ہے تیرا لال۔ منہ پر لالی آرہی ہے۔“

اور غوث کی ماں ناک پر انگلی دھرتی ہوئی بولی۔ ”لالی میرے لال کے چہرے سے گئی ہی کب تھی! — دو چار خراشیں تھیں۔ کل پر سوں تک دوڑنے بھاگنے لگے گا۔ بوڑھے باپ کو پہاڑوں پر جانے کی تکلیف سے بچالے گا — اور — اے متاب بیٹی اندر آ جا۔ باہر دھوپ میں کھڑی کیوں جل رہی ہے؟“

متاب اندر آ گئی اور غوث کے سینے کے زخموں میں پھر بے شمار لمبی لمبی ٹیکلی چونچیں چبھنے لگیں!

”اچھے ہو غوث؟“ اس نے پوچھا۔ اور اس کے سارے جسم کا خون اس کے گالوں میں سمٹ کر یوں تمتانے لگا جیسے پکے پھل کی طرح اس کا رس آپ ہی آپ رسنے لگے گا۔ اس کے مرمت شدہ چولے کے دو ایک ٹانگے ادھڑ گئے تھے جس میں اس کی مرمریں جلد کی ایک شعاع سی نکل رہی تھی!

اور غوث دم بخود لیٹا سوچنے لگا کہ یہ مردوے خود پانی کیوں نہیں بھرتے، خود کھانا کیوں نہیں پکاتے، کڑکتی دوپٹوں میں خود چڑیاں کیوں نہیں اڑاتے، یہ نازک نازک پھول، یہ نور میں ڈھلی ہوئی پتلیاں کیا ایسے کاموں کے لائق ہیں! — اور اس نے دل ہی دل میں موجودہ گھریلو نظام کو بدلنے کے کئی دہقانی طریقے سوچے۔

پھر متاب اور اس کی ماں چلی گئیں اور غوث دو چار دنوں کے بعد

صحن میں گھومنے پھرنے لگا۔

ایک روز لاٹھی ٹیکتا چوہاں پر گیا تو اسے سامنے عطا بیٹھا نظر آیا۔ لاٹھی اٹھی مگر پھر زمین کی طرف جھک گئی اور اس نے سوچا کہ انتقام کے شعلوں پر پانی چھڑکنے کا یہ موقع نہیں۔ پچھٹ کے قریب والے کھیت ہی اس مقصد کے لئے موزوں رہیں گے۔

اور پھر جب وہ مدت کے بعد بھینٹیں ہٹائے ان کھیتوں کے قریب سے گزرا تو اسے عطا دور پہاڑی پر کھڑا نظر آیا۔ اور پھر آن کی آن میں وہ پہاڑی کی پہلی طرف اتر گیا۔ ایک لمحے کے لئے اس کا جسم غصے سے تپ کر انگارہ بن گیا لیکن اسے ان فروغی باتوں کے متعلق سوچنے کی فرصت نہیں تھی۔ اس نے اس تپش پر خنک بوندیاں سی برسانا شروع کر دیں۔ متاب کے ہونٹوں اور آنکھوں اور گالوں کے ہیولے سامنے نیلے آسمان پر تیرنے لگے!

چوٹیوں کی تیز اور ٹھنڈی ہوائیں اپنے ہچکڑے ہوئے دوست کی بلائیں لینے لگیں۔ وہ گھاس میں پتھر اور پگڑی کا تکیہ بنا کر لیٹا ہی تھا کہ اچانک اسے کمر میں کوئی چیز چبھی۔ کروٹ بدل کر دیکھا تو زور سے قہقہے لگاتا ہوا۔

”ارے! میری ہنری!“ — اس نے اپنی گرد آلود ہنری اٹھالی اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے اس کا جائزہ لیا۔ اچانک دو چار مڈیاں اس کے اندر سے نکلیں اور پھدکتی ہوئی گنجان گھاس میں غائب ہو گئیں۔ اور اس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

”میری مظلوم ہنری! مڈیاں گھس گئیں تجھ میں؟ گرد جم گئی تجھ پر؟ ارے ارے!“ اور اس نے پگڑی کے اک پلو سے اسے جھاڑا۔ ”ارے ہچکڑی ہوئی پیاری چیزوں سے مل کر کتنی خوشی ہوتی ہے!“ — اور زبان کی نوک سے ہونٹوں کو تر کر کے اس نے ہنری بجائی۔ ہنری بلبلانے لگی جیسے کہہ رہی ہے۔ ”چھوڑ دے ظالم۔ پھینک دے مجھے۔ بڑا آیا پیار کرنے والا۔ میں اب یہیں اچھی ہوں لاش پر آب حیات چھڑکتا ہے۔ رہنے دے۔ دیکھ تو دھوپ نے میرا روغن ہی اکھیر

پھینکا ہے!"

غوث بنسری کی باتیں سمجھ گیا۔ اسے بغل میں دبا کر وہ جھرنے پر آیا۔ اور ٹھنڈی صاف چٹان پر بیٹھا ہی تھا کہ اسی چٹان کی اوٹ سے ایک شعلہ سا اٹھا! ایک مجسم شعلہ! گھبرائی ہوئی متاب! جس کی آنکھوں کے کٹوروں سے خوف، حیا اور مسرت کے خمار چمک رہے تھے، اور جس کی اماوس کی راتوں ایسے کالے بال اس کے پٹھے پرانے دوپٹے کی گرفت سے نکل کر اس کے سینے کے نشیب و فراز پر لہرا رہے تھے!

"تم؟" غوث بولا۔ اور اس کی بنسری اس کی بغل سے نکل کر چٹان پر کھڑکراتی نیچے گیلی مٹی میں جاگری۔ اور پھر اسے بنسری کا — اس پھڑی ہوئی پیاری چیز کا خیال نہ رہا۔ اس کے سامنے اب بنسری سے زیادہ رسیلی چیز کھڑی تھی۔ متاب کے لبوں پر گھبرائی ہوئی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ہراساں اور متذبذب مسکراہٹ، جیسے وہ مسکراتا چاہتی بھی ہے اور مسکراتا نہیں بھی چاہتی!

"تم متاب؟" غوث نے چٹان پر گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے کہا۔

اری تم؟"

اور متاب کے لبوں میں حرکت آئی جیسے بند کلی سے بھونرے کے نکلنے وقت نرم پنکھریاں تھرتھرا جاتی ہیں۔ "ہاں میں۔"

"تم کہاں؟" — اس پاس چرتی ہوئی بھیڑیں آنکھیں جھپکانے لگیں!

"گھاس کاٹنے آئی ہوں۔" اس نے زمین پر سے رسی اور درانتی

اٹھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہیں گھاس نہیں کاٹنی چاہئے!"

"کیوں؟"

"تمہارے ہاتھ کھردرے ہو جائیں گے!"

اور متاب مسکرا دی۔ لیکن اس مسکراہٹ میں گھبراہٹ یا تذبذب نہ تھا۔ یہ تو صاف ستھری نئی نئی صبح کی طرح بے داغ مسکراہٹ تھی۔ ادھر غوث بھی مسکرانے لگا اور ان مسکراہٹوں نے تصادم سے جو شعلہ ٹوٹا وہ دونوں کے دلوں کو جھلٹاتا ان کے رگ و پے میں سرسرا نے لگا!

"عطا بڑا ظالم ہے۔" متاب بولی۔

"میں اسے مزا چکھا دوں گا کسی دن۔" غوث تن کر بولا۔

"لیکن تم قید ہو جاؤ گے۔" متاب بولی۔

"ہونے دو قید۔ سینے میں یہ سلگتا ہوا بتور تو ٹھنڈا ہو گا۔" اس نے اپنی چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا۔

"لیکن ٹھنڈے بتوروں میں روٹیاں نہیں پکتیں۔ جل جاتی ہیں، یا لٹک کر نیچے راکھ میں گر جاتی ہیں۔"

"کیسی روٹیاں؟" غوث نے حیران ہو کر پوچھا۔

اور متاب مسکرا کر بولی۔ "ارے! میں کیسی بات کہہ گئی!"

لیکن غوث سوچنے لگا کہ واقعی وہ عطا کو اس کے کئے کا پھل دینے کی دھن میں قید ہو جائے گا۔ اور پھر یہ متاب — یہ متاب — یہ متاب! اس کے خیالات متاب سے پرے نہ جاسکے۔ یہیں ہجوم ہو گیا ان کا۔ نہیں۔ وہ قید نہیں ہو گا۔ خدا بڑا منصف ہے۔ وہی عطا سے ٹبٹ لے گا۔

اور یوں اس کے سینے کا بتور بخ بستہ ہو کر رہ گیا!

اس نے متاب کے لئے گھاس کاٹی، گٹھا باندھا اور پھر اس کے پاس آ کر بولا۔ "میں اٹھالاؤں گا یہ گٹھا۔ تم تھک جاؤ گی۔"

"میں نہیں تھکتی۔ ایسے دو گٹھے اٹھالیتی ہوں میں!"

"اچھا!" — اور غوث نے ہنستے ہوئے گٹھا اٹھا کر اس کے سر پر

دھرا تو وہ ڈنگا گئی۔ اور چلائی۔ ”ارے ذر ہلکا کر اسے۔ اس میں پتھر تو نہیں لپیٹ دیئے تو نے۔“

قہقہوں سے یہ ٹھنڈی کھاڑی گونج اٹھی۔ غوث نے گٹھا کھول کر اسے ہلکا کیا اور پھر جب مہتاب جانے لگی تو وہ بولا۔ ”مہتاب۔ گھاس کاٹنے ادھر ہی آ جایا کرو۔ یہاں میں تجھے مدد بھی دوں گا اور پھر یہاں گھاس بھی عام ہے۔“

”گھاس تو پوربی پہاڑیوں پر بھی عام ہے۔“ وہ گٹھے کو پیچھے ہٹا کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”لیکن میں ادھر ہی آ جایا کروں گی۔“

اور غوث کی سانسیں فرط مسرت سے آپس میں گتھم گتھا ہو کر رہ گئیں!

مہتاب روز وہاں آنے لگی۔ دن ڈھلے تک جھرنے کے آئینے میں دونوں کے عکس کانپتے رہتے۔ دیر تک وہی باتیں ہوتی رہتیں جو حضرت وارث شاہ ہیر کے قصے میں لکھ گئے ہیں۔ اور پھر ایک روز عمد و پیمان بھی ہوئے۔ چٹلے بھی بدلے گئے، کپکپاتے ہونٹ بھی ایک دوسرے کو چھو گئے، زلفیں بھی باہوں پر بکھر گئیں اور گال سے گال بھی ملے۔ یعنی وہی کچھ ہوا جو ایک لڑکی لڑکے کی محبت کے دوران ازل سے ہوتا آیا ہے اور ابد تک ہوتا جائے گا۔

اور پھر اچانک یورپ کی قیامت خیز جنگ چھڑی، کروٹنگ افسر اس گاؤں میں بھی آئے، نوکری کی دھن میں غوث بھی لنگوٹا باندھ کر امیدواروں کی قطار میں کھڑا ہو گیا۔ اور جب صاحب اس کے مقابل آئے تو بولے۔

”ول۔ یہ جوان بڑا لڑکا معلوم ہوٹا۔ اس کا سارا باڑی زکھم زکھم ہے۔ ول۔ تم جوان کا نام مانگنا۔“

”غوث“ وہ بولا۔

”گھونس“ صاحب نے ایک کانڈ پر کچھ لکھا اور اسی قطار میں کھڑے ہوئے عطا نے اپنے ایک ساتھی کو ٹوکا دیکر کہا۔ ”کچھ سنا۔ گھونس!“

اور غوث کے سینے کے بیچ بستہ شور سے دو چنگاریاں سی ابھر کر بجھ گئیں۔

صاحب جب عطا کے مقابل آئے تو بولے۔ ”ول۔ تم لوگ کا چھاٹی اس ماپھک“۔ اور انہوں نے ہاتھ کی انگلیاں تان کر ہوا میں ایک بالشت بنائی۔ ”اس ماپھک سے بھی ٹوڑا کم۔ تم لوگ نامرڈ ہے۔“ عطا قطار سے باہر دھکیل دیا گیا۔

اور غوث ہنسی ضبط کرتے ہوئے قریب کے نوجوان کا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔ ”ارے سنا تو نے؟۔ نامرڈ!“ اور عطا کی چھاتی اور بھی سمٹ گئی!

اس روز شام کے بعد غوث نے غلاموں کھمار کو اپنے ہاں بلایا اور بولا۔ ”بے بھی۔ ایک کام کر۔ لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے ورنہ ہم دونوں کل قبروں میں پڑے سڑ رہے ہوں گے۔ لے یہ پانچ روپے۔ ادھر شریف خاں کے گھر چلا جا۔ شریف خان اور اس کی گھر والی باہر ایک شادی پر گئے ہوئے ہیں۔ ان کی بیٹی مہتاب ہے نا۔ وہ بیٹھی ہوگی دالان میں۔ اسے میرا نام کہنیو۔ ہے نا؟ پھر اسے یہ چھلا دکھا دیجو۔ سمجھے؟ اور پھر کہیو۔ کہ ادھر گاؤں کی اتری کھاڑی میں۔۔۔ وہ تمہارے آوے سے کچھ ہٹ کر۔۔۔ بس وہیں آ جائے وہ۔ اور کہیو غوث بھرتی ہو گیا ہے فوج میں۔ جا! لیکن دیکھو۔ اگر کسی کو پتہ چلا تو یہ دو چار بچے کچے دانت بھی توڑ ڈالوں گا۔ لے بھاگ جا۔“

اور غلاموں پانچ روپوں کا نوٹ مٹھی میں دباتے ہوئے بولا۔ ”ارے ملک۔ کیسی باتیں کرتا ہے تو۔ فرشتوں کو بھی پتہ نہ چلے گا۔ ہم نے یہ مونچھیں دھوپ میں سفید نہیں کیں۔“ غلاموں کے ڈاڑھی نہیں تھی!

غوث دیر تک اندھیری کھاڑی میں بیٹھا گول بول سنگریزوں سے کھیلتا

رہا اور پھر جب نیا نیا چاند دور اندھیرے غاروں میں گر گیا تو متاب آنکلی بھیگی ہوئی آنکھیں، بھیگی ہوئی پلکیں، بھیگے ہوئے گال، بھیگا ہوا آنچل۔ سسکیاں بھرتی دھڑام سے غونٹ کے قریب گر گئی۔

غونٹ نے بڑھ کر اسے اٹھایا اور بولا۔ ”اری صبر کر۔ لوٹ آؤں گا میں۔ پہلے بیس جبل پور میں سکھلائی ہوگی ہماری۔ پھر میں چھٹی پر آؤں گا۔ اور پھر۔۔۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا پگی!“

”ہاں میں پگی۔“ وہ روتی بسورتی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اور تو بڑا دانا۔ سولہ سترہ ٹھیکریاں قبول کر لیں۔ اور مجھے پرے پھینک دیا۔ تجھے تو چاندی پیار ہے۔ میں تو یونہی تم سے چٹی پھرتی رہی۔ چاندی کا اتنا شوق تھا تو مجھے کہتا۔ میں چکی پس کر تجھے اتنی رقم کما دیتی۔ یہ لو اپنا چھلا۔“ اس نے انگلی بے چھلا اتارنے کی کوشش شروع کر دی۔

”اری۔ تو تو دیوانی ہو گئی ہے متاب۔“ غونٹ نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”نو کری کرنا ہی پڑتی ہے پگی۔ اور پھر تم جانتی ہو، میرا ابا بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ اب میں ہی تو کمانے والا ہوں سارے گھر میں۔“

”بڑا کماؤ کہیں گا!“ متاب بولی۔ ”یہ کبھت چھلا نہیں اتر رہا ورنہ میں تجھے واپس دے دیتی۔ تو ادھر عجیب عجیب ملکوں میں چلا جائے گا۔ مزے سے دودھ پئے گا۔ گوشت کھائے گا۔ ہر مینے تیری جیب بھاری ہوتی جائے گی۔ میری یاد چاندی کے ڈھیر تلے دبتی جائے گی۔ میری کب پروا کرے گا تو!“

اور غونٹ نے متاب کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”اری تو تو میرے دل میں بسی رہے گی مرتے دم تک۔ تو تو میری زندگی ہے پگی۔ دیوانی تو تو میری خوشی ہے۔ تمہارے لئے تو اپنی جیبیں بھر لاؤں گا میں۔“ اور پھر جب دو بھیگے ہوئے لب۔ دو تپتے ہوئے لبوں سے ملے تو متاب کی ہچکیاں بندھ گئیں اور غونٹ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں!

”اب تم رو دیئے؟“ وہ بولی۔ ”مجھے یاد رکھو گے نا؟ مجھے یاد رکھنا“ سمجھے؟“

اور غونٹ گھٹی ہوئی آواز میں بولا ”اری اتنی پیاری چیز کو بھلا دوں تو موت سے پہلے نہ مر جاؤں! بس کل دس مہینوں کی تو بات ہے۔“ اور پھر غونٹ نے دس چکیاں بجا کر کہا۔ ”یوں گزر جائیں گے یہ دس مہینے۔“

متاب بولی۔ ”میرا تو دسویں چکی کے انتظار میں کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا۔ اور تم دس مہینوں کے لئے جا رہے ہو۔ لیکن دیکھو۔ مجھے یاد رکھنا۔ سمجھے؟“

اور پھر دوسرے روز غونٹ جبل پور روانہ ہو گیا۔ وہاں اس نے امیدوں کے بست سے ایوان بنائے۔ شیشہ جھنڈی کی مشق کرتے ہوئے اس نے کئی بار ان ایوانوں میں متاب کو مسکراتے دیکھا اور پھر اپنے آپ کو بھی انہیں گونجتی چھتوں کے نیچے ٹھٹھا محسوس کیا! بہت ہولے ہولے گزرے یہ دس مہینے اور جب آخری دن آیا تو غونٹ نے یوں محسوس کیا جیسے دس چکیاں بجانے سے بھی زیادہ تیزی سے یہ دس مہینے لڑھک گئے ہیں!

اس روز سب سپاہی بازاروں میں گھروں کے لئے سودا خریدنے گئے تو غونٹ ایک بازار کے پرلے سرے پر کپڑے کی ایک الگ تھلگ دکان میں جا گھسا اور بولا۔ ”آنکھ کے نشے کی قیض۔ زنانہ۔ اور لہلہ جل کی چادر۔ زنانہ۔ اور جارحٹ۔ دوپٹے کے لئے۔ لاد کھا جلدی۔“

اور دکاندار اپنی بڑی بڑی بھوری مونچھوں کے پیچھے مسکرایا۔ ”شادی ہونے والی ہے بابو جی!“

سیٹھ نے جیسے غونٹ کا عزیز ترین راز اس کے سینے سے کھینچ کر فرش پر شیخ دیا ہے، گھبرا سا گیا۔ بولا۔ ”ہاں ہاں۔ کسی کی شادی ہونے والی ہے۔ لے

ذرا جلدی کر۔“

قیمتی ریشمی کپڑوں کی پوٹلی بغل میں دبانا وہ اپنی بارک میں آیا۔ اسے ٹرنک میں سب چیزوں کے نیچے چھپا دیا۔ اور پھر اس روز کعبخت گاڑی بڑی دیر سے آئی۔ اور جب چلی تو کچھوے کو مات کرتی تھی۔ اور لاری بے چاری کے تو جیسے چاروں پیئے پتھر تھے۔ اور پھر قصبے میں اتر کر ٹرنک سر پر رکھتا وہ اس تیزی سے گاؤں کی طرف چلا کہ دوسرے سپاہی اسے دیکھ کر بہت دیر تک قہقہے لگاتے رہے۔!

گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے رستے میں اتری کھاڑی پڑتی تھی۔ اس کی سانس دھونکتی کی طرح چلنے لگی۔ اور پھر غلاموں کھار کا آوا اور پھر غلاموں کی آواز۔ ”دور بلائیں میرے ملک کی۔ دور بلائیں۔ ارے دن کو عید کا چاند دکھائی دے رہا ہے مجھے۔ ٹھہر جا ملک۔ میں اٹھالوں بکس۔“

اور جب غوث نے غلاموں سے ہاتھ ملا کر ٹرنک نہایت بے دلی سے اس کے سر پر رکھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے ریشمی کپڑوں کی پوٹلی اچھل اچھل کر ٹرنک کے ڈھکنے کو پھاڑ کر باہر نکل جانا چاہتی ہے اور ناچنا چاہتی ہے غلاموں کے سامنے۔ اور کہنا چاہتی ہے کہ ہم جبل پور سے آئے ہیں! ”شام کو آئیو میرے پاس سمجھے“ گھر کے قریب پہنچ کر غوث بولا۔ ”اب یہ بکس مجھے دے دے۔“

غلاموں شام کو آنے کا وعدہ کر کے واپس چلا گیا۔ گھر آ کر غوث ماں باپ سے مل کر چوپال پر نکل گیا۔ لمبا کلف کا طرہ ہوا میں پھیلا ہوا تھا اور لٹھے کی چادر قدم قدم پر چیخ چیخ اٹھتی تھی۔ اور پھر وہ کالی گرگابی اور گلابی واسکٹ اور وہ پتلی سی چھڑی۔ اسے ایک جگہ چین ہی نہیں آتا تھا۔ کبھی اس گلی میں جا رہا ہے، کبھی اس گلی میں۔ کبھی یہاں بیٹھا ہے کبھی وہاں۔ کبھی گھر میں ہے تو کبھی آوے کے پاس۔ اور ایک بار تو وہ اتری کھاڑی میں بھی

جھانک آیا۔

خدا خدا کر کے شام ہوئی۔ غلاموں آنکلا۔ اور جب دس روپوں کا نیلا نوٹ اس کی انگلیوں میں اٹکا دیا گیا تو اس کی بیٹھی ہوئی آنکھ بھی پھڑک گئی۔ ”کو۔“ وہ بولا۔

”ارے تو ابھی تک نہیں سمجھا!“ غوث بولا۔ ”مہتاب کی بات بھول گیا تو؟“

”کھی کھی کھی“ وہ دو ایک جھولتے ہوئے پیلے دانت نکال کر ہنسا۔ ”کھی کھی کھی کھی۔ قرآن کی قسم میں بھول گیا تھا۔ خیں خیں خیں خیں! کئی بار گلیوں میں مل جاتی ہے۔ لیکن وہ بات تو بالکل اتر گئی یاد سے۔ عمر گزر گئی ہے نا۔ یہ اپنے اپنے زمانے کی باتیں ہیں۔ کہاں آئے وہ؟“

”دہیں۔“

”اچھا دہیں!۔“

اور پھر جب بہت دیر تک ریشمی کپڑوں کی پوٹلی بغل میں دبائے کھاڑی میں بیٹھا وہ اندھیرے میں ابھرتے ہوئے موہوم دھبوں کو گھورتا رہا تو کنکروں پر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ وہ کھسک کر ایک گول سے پتھر کے پیچھے چھپ گیا۔

”ارے ملک کدھر گیا تو؟!“ گاموں کی بھیانک آواز آئی۔

اور غوث کی امیدوں کے ایوان اینٹ اینٹ ہو کر بکھر گئے۔ پتھر کی اوٹ سے نکل کر پوچھا۔ ”کدھر ہے وہ؟“

”خیں خیں خیں خیں!“ وہ ہنسا! ”ارے ملک۔ ڈر گیا تو؟ وہ آج گھر میں نہیں ہے۔ میں اس کے باپ کے پاس کچھ دیر بیٹھا رہا اور یونہی باتوں باتوں میں پوچھ کہ کدھر گئی مہتاب بیٹی۔ بولا۔ کسی سیلی کے ہاں گئی ہے۔“

”اچھا تو پوچھنے سی۔“ غوث نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ ”اسے صبح

اور غلاموں بولا۔ ”یہ تو تو کہہ رہا ہے نالک۔ آگے بھی تو سن۔ بولی جا کر اسے کہہ دے کہ میں اس عطا کی ہوں جس نے مجھے آنکھ کے نشے کی قیض اور جار جٹ کا۔“

”مگر ملک“ غلاموں نے جیب سے کچھ نکالتے ہوئے کہا۔ ”تو بعد میں آیا ہے۔ تو پرانا ہو چکا ہے اس کے لئے تجھ پر دس مہینوں کی گرد جم چکی ہے نا۔ اور“ لے یہ دس روپے۔ یہ میرا حق نہیں۔“

”تو لے تو آ۔“ وہ غلاموں کو گھورتا ہوا بولا۔ اور جب غلاموں ایک بھاری پتھر اٹھالایا۔ تو غوث نے آنکھ کانٹہ اور بل جل اور جارحٹ کو پتھر پر پسینا۔ کلف گئے طرے کو پھاڑ کر کپڑوں کو پتھر پر کس کر باندھ دیا اور شعلے برساتی ہوئی آنکھوں سے اس گول مول ٹھٹھڑی کو گھورا، اسے اٹھایا، سر پر گھمایا

پوپھی۔ مشرقی افق پر پکھلی ہوئی چاندی کا سیلاب سا ابھرنے لگا اور پھر سورج نے اپنا سر اٹھایا۔ ہر چیز میں زندگی جاگ اٹھی۔ غوث اٹھ کر مکان سے باہر غلاموں کی راہ دیکھنے لگا اور آخر وہ گلی کے موڑ پر سر جھکائے آتا نظر آیا۔

لیکن اس وقت اگر دیواروں کی آنکھیں بھی ہوتیں تو وہ صبر نہ کر سکتا۔ بولا ”یہیں سب کچھ کہہ ڈال۔ ملی؟“

”ہاں ملی۔“ اس نے مایوس لہجے میں جواب دیا۔

”پھر؟“

”بھرباتیں ہوئیں۔ میں نے تمہارا پیغام سنایا۔ تو بولی۔ اچھا آگیا ہے وہ لونڈا! — معاف کرنا ملک۔ اسی کے الفاظ دہرا رہا ہوں — کہنے لگی آگیا ہے وہ؟ چاندی سونے کا بھوکا چھو کر اجسے عطا نے کتے کی مار دی تھی اور باؤلا کر دیا تھا۔ وہ اب مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ اسے جا کر کہہ دے کہ میں تیرا انتظار کب تک کرتی۔ تین سو دن تک کون راہ دیکھتا تیری؟ تو نے سترہ ٹکلیوں سے بھی مجھے ہٹایا سمجھا۔ میں اب عطا کی ہوں۔ تیرے دشمن عطا کی جس نے نوکری

پکا مکان

زمیندار جی کے پختہ اینٹوں کے محل کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ یارو نے راہ چلتے کسی سے سن لیا کہ زمیندار جی کے ہاں مزدوروں کی کمی ہے اور دوسرے دیہات سے نئے مزدور بلائے جا رہے ہیں۔ اس نے پرانے کھل میں دو چھترے لپیٹ کر گٹھڑی بنائی اور زمیندار کے گاؤں کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ صرف چار آنے روز کی مزدوری دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ گاؤں کے پرانے مزدور کام کرنے پر رضامند نہیں ہوتے۔ پہلے تو اس کے دل کی منجھندی میں بھی بغاوت کا ایک ننھا سا جلیبہ اٹھا مگر اس نے ایک لمبی آہ سے اس جلیبے کو اڑا دیا اور زمیندار کے بڑے دروازے پر دستک دے دی۔

اس کے باپ نے ساری عمر جوا کھیلنے میں گنوا دی۔ زمینیں بک گئیں، مکان قرق ہو گئے۔ اس کی بوڑھی ماں تباہی نہ روک سکی۔ روتے روتے آنکھوں کی بصارت کھو بیٹھی اور جس روز اسے اپنے پختہ اینٹوں کے مکان سے باہر دھکیل کر نکالا گیا تو وہ دیوانی سی ہو گئی۔ بیٹھے بیٹھے منہ سے جھاگ برسنے لگا اور تمام اعضا لوہے کی طرح تن جاتے اور کہیں دور ٹھٹکی باندھ کر کہتی۔ ”اور کچھ بگاڑنا

اور پھر گر جتے ہوئے نالے میں دھم کی آواز آئی اور سینکڑوں جلیبے ابھر کر تیز رفتار لہروں پر دور بہ گئے!

”یہ کیا ملک؟“ غلاموں چلایا۔

”یہ میری جوانی کا جنازہ تھا۔“ غوث بولا۔ اور پھر اس نے بچھی پہاڑیوں کا رخ کر لیا۔ غلاموں منہ کھولے وہیں نالے کے کنارے کھڑا اپنی آنکھ جھپکاتا رہا۔ اور غوث پہاڑیوں پر لڑکھڑاتا ہوا اسی جھرنے کے پاس آیا، اسی چٹان کے قریب بھیگی زمین پر بیٹھ گیا، اور پھر یونہی بھیگی مٹی کریدنے لگا!

دو چار لمحوں کے بعد وہ اچانک بھڑک کر پیچھے گر گیا۔ اس کی انگلیوں سے کوئی ٹھنڈی گول سی چیز مس ہوئی۔ ”سانپ!“ اور اس پاس تمام پہاڑیاں فردا، فردا، چیخ اٹھیں۔ ”سانپ! سانپ!“

”نہیں۔ نہیں۔ میری ہنسی!“ غوث بولا۔ آگے بڑھ کر اس نے مٹی کو وحشیانہ طریقے سے کرید کرید کر دور پھینک دیا۔ اور پھر اس کے ہاتھ میں کالی بد نما ہنسی کانپ رہی تھی۔ ”میری بھولی ہنسی!“ وہ بولا۔ اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ زبان کی نوک سے ہونٹوں کو تر کیا اور ہنسی کو ان کے قریب لا کر سانس دی۔ ہنسی سے ایک ہولناک سی پھٹکار بلند ہوئی۔ اس میں سے گیلی مٹی کا ایک سانپ سائل کر جھرنے میں جاگرا اور پھر ذرہ ذرہ ہو کر تہ پر بیٹھ گیا۔

☆

ہے تو بگاڑ لے، ٹھنڈی کر لے اپنی پیاس، مٹالے اپنی بھوک، اگر تجھے کوئی اور انسان نہیں ملتا تو یارو کی ماں پر بجلیاں برسا اور قہقہے مار کہ تو آسمان پر بیٹھا اس زمین کی ایک ٹخیف و غرولہ ہستی سے مذاق کر رہا ہے۔ اور یہ کہہ کر وہ اس زور سے طرا "ہستی کہ منڈیروں پر بیٹھی ہوئی چڑیاں پھر سے اڑ جاتیں، پڑوسیوں کی مرغیاں کڑکڑانے لگتیں اور مسجد میں بیٹھے ہوئے مولوی جی تسبیح کے دانوں کو مٹھی میں مروڑ کر کہتے۔ "حد ہو گئی ہے۔ اس گاؤں پر عنقریب کوٹے کا سا قہر ٹوٹے گا۔" اور ایک روز تو تنگ آکر انہوں نے بھری مسجد کے سامنے کہہ ڈالا۔ "یہ کٹنی کفر بکیتی ہے۔ اگر اسلامی حکومت ہوتی تو اسے دلو پر چڑھا دیا جاتا۔ اس کا حقہ پانی بند کر دینا چاہیے۔"

لیکن حقہ پانی بند کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ وہ اس رات ایک تارے کی طرف ٹھنکی باندھے دیکھتی رہی، اور جب یارو یہ کہتا ہوا اندر آیا کہ "ہمارے کلکڑوں پر پلا ہوا بھاب ہم پر ہی آواز دے کتا ہے۔" اور آگے بڑھ کر اپنی ماں کا شانہ ہلایا تو وہ ایک طرف گر گئی اور دھندلے دیئے سے اس کی پتھراتی ہوئی آنکھیں چمکنے لگیں۔ آسمان والے کا مذاق اپنی خچیل کو پہنچ چکا تھا۔

اس کا باپ اس سبکی سے گھبرا کر کسی رات گھر سے نکل بھاگا۔ یارو اسے تھل کے ویرانوں تک ڈھونڈھ آیا لیکن اس کا کہیں پتہ نہ چلا اور اس کی ماں کی موت کے دس دن بعد اسے کندیاں اسٹیشن سے اپنے دوست کرموں کا خط ملا کہ تمہارا باپ آج اسٹیشن کے جنگلے کے پاس مروہ پایا گیا ہے۔ اس کے منہ سے افیون کی بو کے بجائے اٹھ رہے تھے۔

وہ کندیاں پہنچا اور باپ کی قبر کو جا کر چوما جو ایک ننھی سی ویران ڈھیری کی طرح زمین کی سطح سے تھوڑی سی ابھری ہوئی تھی اور جس پر دو کوٹے بیٹھے کائیں کائیں کر رہے تھے۔

کرموں نے اسے سمجھایا بجھایا کہ "میں اسٹیشن پر قلی بن جاؤ۔ روز

آٹھ دس آنے کما لو گے، مزے سے گزر ہو گی۔ یہیں شادی کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ دو لڑکیاں میری نظر میں ہیں وہ جو دو ننھے ننھے نیم کھڑے ہیں نا جو ہڑ کے کنارے، بس ان کی طرح خوبصورت۔ نو خیز اور کچیلی۔ تم دیکھو تو عمر بھران کی بکریاں چراتے رہو۔" رانجھے کی طرح۔

مگر یارو کے دل پر کرموں کی ان ہلکی پھلکی باتوں نے کوئی اثر نہ چھوڑا۔ وہ اپنے گاؤں لوٹ آیا۔ گھر کا بچا کھچا سامان بیچ کر دو روپے جمع کر لئے اور ریوڑیوں بتاشوں کی دکان کھول لی۔ لیکن گاؤں میں نقد سودا اس طرح مشکل ہے جیسے تند آندھیوں میں دیا جلانا۔ ریوڑیاں بتاشے دو چار دنوں میں قرضہ کی صورت میں اس کے ہاتھوں سے نکل گئے اور صرف دو بوسیدہ چنگیریں اس کے پاس رہ گئیں۔ انہیں بیچ کر دو دن پیٹ بھرا۔ دو دن بھوکا رہا اور پھر ادھر زمیندار جی کے پختہ اینٹوں کے محل کی خبر من لی۔

زمیندار جی کے بڑے دروازے پر دستک دیکر وہ بہت دیر تک کسی کی آمد کا منتظر کھڑا رہا۔ آخر آہنسی رنگ کے ایک گرانڈیل حبشی نے کواڑ کھولے اور ڈپٹ کر پوچھا۔ "کون ہے تو؟ کیا کام ہے؟"

"میں مزدوری کرنے آیا ہوں۔" یارو نے یہ الفاظ یوں کہے جیسے وہ زمیندار جی کے سارے خاندان پر کوئی بہت بڑا احسان دھرنے آیا ہے۔

حبشی کے نتھنے پھول گئے جیسے اچانک سیاہ آسمان میں دو سوراخ پڑ گئے ہوں۔ پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ "مزدوری کرنے آیا ہے! — ارے سالے مزدوری کیلئے کیا زمیندار جی کی بیٹھک کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے! وہ سو رہے تھے۔ اگر ان کی آنکھ کھل جاتی تو قسم خدا کی، بوٹیاں نچو الیتا ان کے کتوں سے۔ اکھڑواہیات، پوقوف!"

یارو خاموش رہا کیونکہ اب کواڑ بند ہو چکے تھے اور اسے مزدوری کی ضرورت بھی تھی۔

نئے مکان کا پتہ پوچھتا کارندے کے پاس پہنچا اور چار آنہ روز کی مزدوری پر پختہ اینٹیں اور گارا ڈھونڈنے لگا۔

دو چار راتیں تو واپس گھر آکر بسر کیں۔ لیکن ایک بار جب وہ تھا ماندہ نئے محل کے قریب پہنچا تو ایک طرف سے زمیندار جی اٹھے اور بولے۔
’ارے تو پوچھے کیوں نہیں آتا؟ اگر کل بھی اس وقت آیا تو گدی میں گھونسا جما کر دھکیل دوں گا۔ لفنگا کہیں کا۔ سولہ پیسے دیتے ہیں۔ بیگار تھوڑی لیتے ہیں!“
منجھندی میں چند ننھے ننھے بلبلے پھر ابھرے اور وہ بھول گیا کہ اس کا مکان بک چکا ہے اور اسکی خاناں برہادی دنیا کو معلوم ہے۔ بولا۔ ”سب لوگ اسی وقت آتے ہیں۔“

زمیندار جی پھر گئے۔ اپنی گھر کی کا جواب — چاہے وہ صحیح ہو یا غلط — انہیں ہمیشہ ناگوار گزرتا تھا۔ چلائے۔ ”اور یہ سب تیرے باپ پھر رہے ہیں یہاں؟“

یارو کندھے جھکاتا پکی اینٹوں کے ڈھیر کی طرف چلا گیا۔ بلبلے زمیندار جی کی پھنکار سے اڑ گئے تھے۔

گاؤں سے باہر ایک ڈھیری پر ایک بوڑھے مزدور نے سر کندھے کا ایک جھونپڑا بنا رکھا تھا۔ شام کو ادھر ہی کا رخ کیا۔ بوڑھے کی منت سماجت کی اور اب وہ اسی کے ہاں رہنے لگا۔

گاؤں کے کنوئیں کی طرف جانے والی پلڈنڈی اس جھونپڑے کے سامنے سے گزرتی تھی۔ دو کھٹولے جھونپڑے میں سماتے تھے۔ ایک پر بوڑھے کے چیتھڑے پڑے رہتے تھے اور دوسرے پر بوڑھا سونے کی کوششیں کیا کرتا تھا۔ یارو کی آمد پر چیتھڑے ایک انگلی پر ٹکا دیئے گئے۔ رات رات بھر بوڑھا کھانسا رہتا اور یارو سے عجیب عجیب باتیں کرتا۔

”یارو بیٹا۔ یہ مزدوری تمہیں نہیں پھتی۔ مرجاؤ یا یہاں سے چلے جاؤ

کیونکہ جب زمیندار اور اس کا کارندہ تمہیں گھر کتے ہیں، تو وہ ایک تمہاری توہین نہیں کرتے۔ دنیا کے سب جوانوں کے منہ پر تھوکتے ہیں۔ تم جوان ہو کر ذلیل لوگوں کے اشاروں پر اٹھتے بیٹھتے ہو۔ تف ہے تمہاری جوانی پر اور تف ہے تمہاری اس عقل پر جو غیرت کو دو کڑیوں کے مول بیچ کر ذرہ بھر نہیں کسماتی۔“

”یارو بیٹا۔ شہروں میں جا کر مزدوری کرو۔ دیہات میں تو مزدور ایک حقیر کتے کی طرح ہے جسے کبھی کبھی تو وہ سب کچھ بھی اگل دینا پڑتا ہے جو اس نے در در پر دم ہلانے اور پاؤں چاٹنے سے حاصل کیا ہو۔ لو اب سو جاؤ۔ دیا بجھ چلا ہے!“

”یارو بیٹا۔ جانتے ہو زندگی کیا ہے؟ زندگی چند سانسوں سے بنی ہوئی ایک گیند ہے جو تقدیر کے شریر بچے کے ہاتھوں میں اچھلتی ہے، لڑھکتی ہے، ناچتی ہے اور جانتے ہو ہر گیند کی قسمت میں گھٹنا اور پھٹنا لکھا ہے؟ اگر تم اس گیند کو تقدیر کے ہاتھوں سے چھین کر اپنے بس میں کر لو تو تمہارا جینا سچا جینا ہے ورنہ کبھی یہ سانسوں کا تانا بانا تار تار ہو جائے گا اور تم نے شاید اس بات پر کبھی غور نہیں کیا کہ تقدیر کے پاس صرف ایک گیند نہیں۔ لاتعداد کھلونے ہیں۔ کسی ایک گیند کا کھو جانا اسے کسی حالت میں بھی ناگوار نہیں گزر سکتا۔“

اور ایک رات تو بوڑھے نے چنچتے ہوئے کھٹولے پر کروٹ بدل کر اور سامنے پتلے گارے سے لپی ہوئی دیوار پر پٹاخ سے بلفم کا ایک گولا مارتے ہوئے کہا۔ ”یارو بیٹا۔ جتنا ہو سکے عورت ذات سے دامن بچائے رکھنا۔ یہ زہریلی ناگنیں ہوتی ہیں۔ انسان ان کی ملائم جلد اور مستانہ چال پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ یہ ڈنک بھی مار سکتی ہیں۔ میں نے ایک عورت کے ہاتھوں بہت دکھ سہے ہیں بیٹا۔ اور جانتے ہو وہ آج کل کہاں ہے؟ اسی علاقے کے ایک گاؤں کے زلیدار کی ماں ہے۔ بد بخت روپے پیسے پر رتبہ گئی

اور اینٹوں کے بھٹے کی طرف اڑ گئے۔

سارا دن یہ خیال اس کے گرد آلود خیال کو کھرچتا رہا کہ وہ شوخ اور طرار لڑکی کون ہے اور میں اس سے کس درجہ اکھرپنے سے پیش آیا ہوں — تھکا ماندہ اور کھویا کھویا پتلا گارا ڈھوتا رہا۔ ایک بار ٹھوکر کھا کر ٹوکری سمیت کارندے کی آرام کرسی کے قریب گر پڑا۔ اس کے کپڑوں پر گارے کی چھینٹیں جا پڑیں۔ اپنا سینہ اور ٹھوڑی زخمی کر بیٹھا۔ کارندے کی جھڑکیاں چپ چاپ سنتا رہا۔ سر اٹکائے جھونپڑے میں آیا تو بوڑھا ٹین کے پیالے میں بنفشہ بھگور رہا تھا۔ کھولے پردھم سے گرا تو بوڑھے نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“ — پریشان کیوں ہو؟“ — اور پھر اسے خاموش پا کر بولا۔ ”یارو بیٹا۔ لمبی عمر کا راز بے فکری اور بے پروائی ہے۔ وہ جو بڑے بڑے حادثوں کو مذاق سمجھ کر ٹال دیتے ہیں بہت مدت تک زندہ رہتے ہیں اور جو ذرا سے واقعہ کو قیامت سمجھ کر اپنا جی ہلکان کرتے رہتے ہیں۔ موت کو وقت سے پہلے دعوت دیتے ہیں۔ تم —“

اور آج پہلی بار یارو نے بوڑھے کی بات کاٹی۔ ”بابا تم نے کل ناگوں کی بات چھیڑی تھی نا۔“

بوڑھا دیئے کے چاروں طرف سے مردہ پروانوں کو نیچے گرا کر کھولے پر لیٹ گیا اور بولا۔ ”کیوں خیر تو ہے؟“

اور یارو نے روحانی پریشانیوں کو ایک ہلکی سی کھیانی مسکراہٹ کے نیچے دباتے ہوئے کہا۔ ”کوئی خاص بات نہیں۔ البتہ میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا ناگنیں سدھائی نہیں جاسکتیں؟ کیا ان کے دانت نکال دیئے جائیں تو وہ نقصان پہنچا سکتی ہیں؟“

کہنی کے بل ہو کر بوڑھا کچھ سوچنے لگا اور پھر مدھم آواز میں بولا۔

”لیکن بیٹا میں نے جن ناگوں کی تم سے باتیں کی ہیں ان کے دانت نکالنا بھول گیا۔ مجھے تو ناگوں نے کانا ہے۔ پالتو ناگوں نے کانا ہے۔ مجھے ناگوں کے

اور ان راتوں کو بھول بیٹھی جن کی یاد آج تک اینٹوں کے بھٹے کے اس طرف پرانے شیشم کی گھنی چاؤں میں سائیں سائیں کر رہی ہے — سن رہے ہو میری باتیں؟ — سو جاؤ۔ دیا بجھ چلا ہے۔“

دوسرے روز جب یارو منہ اندھیرے اٹھا اور چہرے پر بخ پانی کا ایک پھینٹا مار کر جھونپڑے سے باہر قدم دھراتا اچانک کسی چیز سے ٹکرایا۔ دھڑاک کی آواز آئی اور یارو کے سارے کپڑے بھیگ گئے۔ پڑوس کے کسی جھونپڑے میں ایک کتا آٹے کی مشین کی طرح بھونکتا ہوا اٹھا اور آواز کی تلاش میں دور نکل گیا۔ یارو اس ناگمانی حادثے کے متعلق ابھی تک سوچ ہی نہیں سکا تھا کہ آواز آئی۔ ”اندھے ہو؟“

”نہیں“ یارو نے جواب دیا۔ ”اندھا تو نہیں ہوں البتہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ادھر سے کوئی اندھا گزر رہا ہے۔“

یہ کہہ کر یارو کے جسم میں ایک پھریری سی دوڑ گئی۔ وہ کسی ہم پیشہ مزدور سے مخاطب نہ تھا۔ اس کے سامنے ایک عورت کھڑی تھی جس کی باریک اور تیز آواز اس کے شباب کی غمازی کر رہی تھی۔ یارو نے اپنے کپڑوں کو ہولے ہولے جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں شرمندہ ہوں۔“

”شرمندہ ہوں۔“ آواز میں زہریلی طنز تھی۔ ”گائیں بھی پھوڑ ڈالیں اور اوپر سے آوازے بھی کتا ہے۔ لفنگا، آوارہ، واہیات۔“

عورت کی پرچھائیں تیزی سے بازو ہلاتی جھونپڑے کے اس طرف غائب ہو گئی اور اچانک یارو کو محسوس ہوا جیسے اسے کسی ناگن نے ڈس لیا ہے۔ ملائم جلد اور مستانہ چال والی ناگن۔ جس کے کانٹے کا منتر نہیں اور کانٹا جس کی فطرت ہے اور —

اور اندر بوڑھا کھانسا اور کھانسی کے جھکوں سے کھولے کی چولیں چرائیں اور چولوں کی چرچر اہٹ سے چونک کر اندر سے چڑا اور چڑیا پھر سے نکلے

سدھانے کے گر نہیں آتے۔۔۔ لو اب سو جاؤ۔ تیل بھی ختم ہو چلا ہے دیئے میں۔ لو چمکنے لگی ہے۔“

اس روز وہ شام کو گھر واپس آ رہا تھا۔ بڑھتے ہوئے دھندلکے میں تیزی سے اڑتے ہوئے پرندوں کے سائے یکے بعد دیگر تیر کی طرح اس کے سر پر سے سائیں سائیں کرتے گزر جاتے تھے اور گنجان نیوں کی ٹہنیاں پھدکتی اور چیختی ہوئی چڑیوں سے پٹی پڑی تھیں۔ مٹی ہوئی روشنی اور ابھرتے ہوئے اندھیرے نے اس کی روح میں ایک پھریری سی دوڑا دی۔ اس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ اس گاؤں میں صرف ناگنوں کو سدھانے آیا ہے۔ لپکتی ہوئی پرچھائیوں کے ہیولے اس کے ذہن پر ابھرتے اور تیز تیز قدم اٹھاتے پورب سے ابلتی ہوئی ظلمتوں میں کھو جاتے۔ راہ کی دونوں طرف اگی ہوئی گنجان جھاڑیوں میں چیختے ہوئے مڈے اسے بہت پیارے معلوم ہونے لگے جو اندھیرے میں بیٹھے اپنے من پر چارہ تھے۔ اور پاس ہی کنویں میں لٹکے ہوئے مین کے ڈولوں کی کھڑکھڑاہٹوں میں اسے کوئی ایسا زندگی بخش نغمہ سنائی دینے لگا جس کے زیر و بم پر بوڑھے وقت کے قدم اٹھتے ہیں۔ اس نے اچانک دن بھر کی تھکن اور اس طویل بے معنی سوچ کی وجہ سے پیاس محسوس کی اور اسی دھن میں کنویں کا رخ کر لیا۔ تین لڑکیاں سروں اور کولہو پر گاگریں رکھے جانے ہی والی تھیں کہ وہ کنویں کے بلند چوترے پر چڑھتا ہوا بولا۔ ”ہو سکے تو چلو بھر پانی پلا دو۔“

ایک بولی۔ ”خود نکال لے۔“

اس نے مسکین لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن میرے پاس رسی اور ڈول نہیں۔“

دوسری نے گاگر کو سر پر پھراتے ہوئے کہا۔ ”تو لٹک جا نیچے۔ اتنا بڑا مسئلہ ہے۔ اللہ قسم تو ہاتھ لٹکائے تو پاتاں کی خبر لے آئے۔“ اور پھر تینوں نے

زور زور سے قہقہے لگائے اور گاگریں سنہلانی مقلقتی ہوئی چل دیں اور پھر ان میں سے ایک پٹی اور بولی۔ ”لیکن تو کہاں کا رہنے والا ہے؟“ وہ بڑبڑایا۔ ”پردیسی ہوں یہاں مزدوری کرتا ہوں زمیندار جی کے کپے مکان پر۔“

لڑکی ایک قدم آگے بڑھا کر بولی۔ ”اور تو رہتا کہاں ہے؟“

”ادھر راستے پر جو پہلا جھونپڑا پڑتا ہے نا وہاں۔“

اور لڑکی تن کو بولی۔ ”کل شام کو کیا آنکھیں نکلا ڈالی تھیں کہ میری گاگروں کا ستیاناس کر دیا اور اب پانی پینے آیا ہے۔ دوپہر سے ڈول لٹکا لٹکا کر اور رسیاں کھینچ کھینچ کر جو دو گھونٹ جمع کئے ہیں وہ تجھے پلا دیں اور خود بابا کے جوتے کھائیں۔ آ جاتے ہیں وہاں سے مزدوریاں کرنے موئے کھینچ لے کے!“

یارو کے گلے سے جیسے ناگنیں لپٹ گئی ہیں۔ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ ”گاگر کے پیسے لے لے مجھ سے اور اتنے بڑے بول نہ بول کہ میں پردیسی ہوں اور تو نوجوان لڑکی ہے۔۔۔ ورنہ اگر میرا بھی یہی گاؤں ہوتا اور کوئی لڑکی مجھ سے اس طرح باتیں کرتی تو یوں چٹکی میں دبا کر مسل ڈالتا۔“ اور یارو نے دن بھر کی مزدوری اپنی جیب سے نکالی اور اس کے قدموں میں پھینک کر پتھر لے رستے پر کنکر اڑاتا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

اور جب دیا بجھ گیا اور بوڑھے کے حلق میں بلغم چیننے لگا تو کروٹیں بدلتے بدلتے اس کے شانے چھل گئے۔ وہ حیران تھا کہ اسے نیند کیوں نہیں آتی اور اس کے تصورات پر کنویں کا چوترہ ایک پتلے سائے سمیت ابھر کر کہاں غائب ہو جاتا ہے!

آدھی رات کو اس نے جھونپڑے کے باہر کسی کی دیوار سے لگ کر ہو لے ہو لے چلنے کی آواز سنی۔ آواز جھونپڑے کے دروازے پر آ کر رک گئی

اور بہت دیر تک خاموشی طاری رہی۔ وہ چپکے سے کھولے سے اتر کر دروازے تک آیا۔ خاموشی سے دروازہ کھولا اور ادھر ادھر بھیانک اندھیرے میں آنکھیں جھپکانے لگا کہ اچانک اس کے شانے کو کسی نے چھوا اور پتلی سی آواز آئی ”لے“۔ دو دونیاں اس کی مٹھی میں گھسیڑ دی گئیں۔ اور قبل اس کے کہ وہ اپنی زبان ہلا سکتا ایک پتلی سی پرچھائیں جھونپڑے کے اس طرف لپک کر غائب ہو گئی! اور اچانک اسے محسوس ہوا جیسے اس نے ایک زہریلی ناگن کے دانت نکال لئے ہیں!

اس دن سے وہ گلی میں گزرنے والی ہر لڑکی کو گھور کر دیکھنے لگا۔ دراصل شام اور پونپھٹنے کے دھند لکوں میں لپٹے ہوئے چہرے کو وہ اچھی طرح نہیں دیکھ سکتا تھا اور اس کی زبردست خواہش تھی کہ ایک بار اسے اچھی طرح دیکھے۔ گاؤں میں اس نوجوان پردہ کی مزدور کی دیدہ دلیری کے تذکرے ہونے لگے اور ایک روز چوپال پر ایک بوڑھے نے یہاں تک کہہ ڈالا۔ ”اگر یہی حالت رہی تو وہ دن دور نہیں جب یہ لفتنگا کسی کی ناک کاٹ کر ہوا ہو جائے گا اور پھر ہم سب ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ اس کا بندوبست کرنا چاہیے۔“

اور زمیندار جی اپنے عصا پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ”میں انتظام کر لوں گا۔“

اسی روز زمیندار جی کے پکے مکان کی چھت ڈالی جانے والی تھی۔ وہ صبح سویرے اٹھا اور جب کنویں کے قریب سے گزرا تو پتھریلی راہ پر اسے ایک لڑکی نظر آئی گاگریں اٹھائے ہوئے۔ ایک جھکی ہوئی بیری کے تنے کے پاس کھڑی تھی۔ وہ اسے گھورتا ہوا اس کے قریب سے گزرا تو اس کی جی میں کسی احساس نے سرگوشی کی۔ ”ارے یہاں ٹھنک کر کھڑا ہو جا اور اس سے پوچھ لے کہ کیا تم ہی تو وہ لڑکی نہیں ہو جس نے مجھے اس روز کنویں پر دو چھو کریوں کے سامنے جھڑک دیا تھا۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں نے تمہاری باتوں کا برا مانا ہے۔“

ہرگز نہیں۔ یہ شک تمہیں کیسے گذرا! میں تو حیران ہوں کہ تمہیں یہاں چھوڑ کر اپنے گاؤں کیسے جاؤں گا۔ یوں کرو کہ مجھے صبح شام کا کھانا دے دیا کرو میں تمہارے لئے بغیر کسی اجرت کے پانی بھرتا رہوں گا۔ اور انہی خیالات کے زیر اثر وہ ٹھنک کر کھڑا ہو گیا اور جب اس کے دماغ کے ریگزاروں میں مختلف تصورات کے گولے چپختے ہوئے گزرنے لگے تو اچانک اس کے کانوں میں آواز آئی۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“

”اچھا تم ہو۔“ یارو آگے بڑھ کر بولا۔

”دیکھو“ وہ کمر پر گاگر کو اچھی طرح جھاتے ہوئے بولی۔ ”تم نے گاؤں والوں کی باتیں سن لی ہوں گی۔ عجب نہیں کہ کوئی کبخت تمہیں دن دھاڑے پیٹ ڈالے۔ تم پردہ کی ہو اور گو میں تمہیں اتنا اچھا تو نہیں سمجھتی کیونکہ تم نے میری گاگریں توڑ ڈالی تھیں اور اس روز کنویں پر تم نے خوب نتھنے پھڑکائے تھے، لیکن میں تمہیں بے عزت ہوتا بھی نہیں دیکھ سکتی۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ پچھلے چند دنوں سے تم لڑکیوں کو پاگلوں کی طرح کیوں گھورنے لگے ہو؟“ اور اس نے کولہ سے گاگر اتار کر بیری کے تنے سے لگادی۔

پوچھٹ چکی تھی اور چیلوں اور کوؤں کے غول دیرانوں سے گاؤں کی طرف اڑے جا رہے تھے۔ دور بلندی پر گاؤں کی بڑی گلی پر سے چند پنہاریاں اتر رہی تھیں۔ یارو نے خشک گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”بات یہ ہے کہ اس روز شام کے اندھیرے میں میں تمہیں اچھی طرح نہ دیکھ سکا تھا۔ اس لئے میں چاہتا تھا کہ تمہیں ڈھونڈ نکالوں۔ مجھے صرف تمہاری تلاش تھی۔ میں۔ میں۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا میں تمہیں پہچان لوں گا۔“

اور وہ بولی۔ ”لیکن تم مجھے نہیں پہچان سکے۔ کیونکہ کئی بار گلی میں تم نے مجھے بھی گھورا لیکن منہ کھولے آنکھیں جھپکاتے تم آگے نکل گئے۔ تم بہت بھولے ہو، خیر اب یہاں سے بھاگ نکلو کیونکہ سنا ہے زمیندار جی بھی تم پر غصے

ہو رہے تھے۔“

یارو نے بدحواس ہو کر پوچھا۔ ”لیکن تم۔۔۔“

”میں یہیں رہوں گی۔“ وہ بولی۔ ”میں یہیں کی رہنے والی ہوں۔“

اور اس نے پھر پوچھا۔ ”لیکن میں۔۔۔“

”تم پردیسی ہو۔“ اس نے جواب دیا۔

”لیکن۔۔۔ لیکن مجھے تم سے انس ہو گیا ہے۔“ اس نے ہچکچاتے

ہوئے اپنا روحانی طوفان چند الفاظ کے ذریعے اگل ڈالا۔

لڑکی نے گاگر اٹھالی اور بولی۔ ”بہت اچھی بات ہے۔ لیکن تم مجھے

چاہنے کی دھن میں اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ اگر تمہارا یہی گاؤں

ہوتا، یہیں مکان ہوتا تو تم مجھے شوق سے چاہ سکتے تھے کیونکہ چاہت بری بات

نہیں۔ لیکن اب ایسا مشکل ہے۔ البتہ میں تمہیں یاد رکھوں گی کیونکہ تم بہت

سادے اور غصیلے نوجوان ہو۔“

یارو کا جسم تپ رہا تھا۔ ہونٹ سوکھ گئے تھے۔ آنکھیں ڈبڈبائی

تھیں۔ بولا ”لیکن اگر ایک روز میں یہیں آکر پختہ اینٹوں کا ایک مکان بنواؤں

پھر؟۔۔۔“

اور وہ مسکرا کر بولی۔ ”جس روز تم نے یہاں پکا مکان تیار کر لیا اور

جس روز اس مکان کی چھت ڈالی گئی میں شام کے بعد اندھیرا ہوتے ہی تم سے

ملنے اور تمہارے نئے مکان میں دیا جلانے آؤں گی۔“ اور وہ تیزی سے پتھریلی

پگڈنڈی پر لہراتی ہوئی نکل گئی۔ اور وہ وہیں سے اپنے جھونپڑے کی طرف واپس

دب پڑا اور بوڑھے سے اجازت چاہی۔ بوڑھا بولا۔ ”میں خود تمہیں یہاں سے

چلے جانے کو کہہ دیتا مگر مجھے خوف تھا کہ تمہارے دل کو نہیں نہ پہنچے۔ دل بہت

نازک چیز ہے بیٹا، اور جب اس کو دردا سی نہیں بھی لگ جائے تو چکنا چور ہو جاتا

ہے۔ میں اپنے سینے میں دل کے آگینے کی کرسیاں اٹھائے پھرتا ہوں اور آج تک

اسے کوئی شیشہ ساز نہیں جوڑ سکا۔ اچھا خدا حافظ۔“ یارو وہاں سے چلا آیا

اور ایک بڑے شہر میں آکر مٹھائی کی ایک منہی سی دکان کھول لی۔ کچھ دنوں ہی

میں اس کی دکان چمک اٹھی اور چند مہینوں میں اس نے پختہ اینٹوں کا ایک ننھا سا

مکان بنانے کا خاصا سرمایہ جمع کر لیا۔

وہ یہ سب کچھ ایک لطیف اور شدید جذبے کے تحت کرتا رہا۔ ایک

روز شام کے وقت وہ اسی گاؤں میں واپس آیا اور بوڑھے سے مل کر اسے سارا

حال سنایا۔ بوڑھے نے کہا۔ ”میں کب سے قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ میرا

کوئی بیٹا نہیں۔ کوئی عزیز نہیں۔ تمہارے ساتھ میں نے چند دن اچھے کائے ہیں

اور گو یہ جھونپڑا سارے گاؤں سے الگ ایک ڈھیری پر کھڑا ہے لیکن اگر تم

یہاں مکان بنواؤ تو مجھے کوئی عذر نہیں۔ مگر دیکھو۔ کچی اینٹوں کا مکان نہ بنانا۔

کیونکہ آج کل لوگ کچی اور پکی اینٹوں کے ترازو میں انسان کی عزت اور آبرو

کو تولتے ہیں۔ جو نہی تم نے پکی اینٹیں منگانا شروع کیں لوگ تمہاری طرف

جھک جائیں گے۔ بھری ہوئی جیب ہی آج کل عزت ناموس کی کنجی ہے۔“

اور جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ بد معاش مزدور شہر میں جا کر بہت کچھ

کما لایا ہے اور وہ پکی اینٹوں کا ایک مکان بنانے کی فکر میں ہے تو اس کے ارد

گرد اچھے اچھے سفید ریشوں کا جھکھٹ رہنے لگا۔ لیکن زمیندار جی بدبڑاتے

رہے اور ایک روز بولے۔ ”کہیں سے چوری کر لایا ہو گا۔ ورنہ پختہ اینٹوں کا

مکان میرے بغیر کون تیار کرا سکتا ہے، گاؤں کے سردار کا مقابلہ کرتا ہے۔

قسم خدا کی کسی روز ایسا ہاتھ دکھاؤں گا کہ یاد رکھے گا مرتے دم تک۔“

ادھر دیواریں اٹھنے لگیں اور خستہ و پامال جھونپڑے کی جگہ ایک کچے

مکان نے لے لی۔ اس تمام عرصے میں اس کے دل کی خلوتوں میں یہ خیال ٹپٹپ

بکر اٹھتا کہ کہیں وہ اپنا وعدہ بھول ہی نہ چکی ہو، اور یہ پختہ اینٹوں کا محل ویران

ہی نہ رہ جائے۔ لیکن اکثر گاؤں کی بڑی گلی کے آخری سرے پر کھڑے ہو کر وہ

بہت دور نشیب میں کنویں کے اس طرف جھکی ہوئی بھری کو جا کر دیکھ آتا اور گزرے ہوئے دنوں کی پرچھائیاں تیرتی ہوئی آتیں اور اس کے دل پر اطمینان کی پھواریں برسا کر فضاؤں میں تحلیل ہو جاتیں۔

ایک روز اس کے کانوں میں یہ اثراتی ہوئی خبر پہنچی کہ زمیندار جی کی بیشک سے سرپا چوری ہو گیا ہے اور انہوں نے تھانے جا کر رپورٹ کر دی ہے۔ لپک کر اپنے سرپے کو دیکھا جو ایک کونے میں محفوظ رکھا تھا۔ آخر کار وہ دن بھی آ پہنچا جب اس کے مکان پر چھت ڈالی جانے والی تھی۔ آن کی آن میں شہتیر جمائے گئے، مٹی ڈالی گئی اور شام سے بہت پہلے مولوی جی نے اس کے مکان کے سامنے کھڑے ہو کر دعا مانگی۔ ”اے الہ العلیٰ! یہ مکان حلال کی کمائی سے تیار ہوا ہے۔ اسے اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھ اور اس میں بسنے والوں پر اپنا کرم برسا کہ تو بہت بڑا فضل کرنے والا اور مہربان ہے۔“

جب وہ سب لوگوں کو رخصت کر چکا اور بوڑھا اسے دعائیں دیتا کسی دوست کے ہاں چلا گیا تو اس نے اندر جا کر رنگین پٹنگ پر بستر بچھایا۔ ریشمی چادر پھیلائی اور اس کے پائے کا سہارا لے کر نیچے گیلے فرش پر یوں دم سادھ کر بیٹھ گیا جیسے ابھی چند لمحوں میں اسے کائنات کے کروٹ بدلنے کا انتظار ہے۔

ایک بار دور سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ دروازے تک آیا اور ابھی وہ چاروں طرف اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا کہ بہت سے مضبوط ہاتھ اس کی گردن اور بانہوں پر پڑے اور جب اس نے اپنے حواس مجتمع کئے تو اس نے دیکھا کہ اس کی کلائیوں میں ہتھکڑیاں بٹھنھن رہی تھیں۔

”کیا بات ہے؟“ وہ چیخا۔

اور پولیس کا ایک افسر بولا۔ ”تم نے زمیندار جی کا سرپا چرایا ہے اور حوالات کی سلاخوں میں بند ہو کر تمہیں سب باتیں سمجھ میں آ جائیں گی۔ تیز قہقہہ اٹھاؤ۔“ اور یارو کی پسلیوں میں پولیس افسر نے ایک بہت سخت ٹھوکا دیا۔

اور جب اس نے پلٹ کر اپنے مکان کی طرف دیکھا تو برآمدے میں اسے ایک پرچھائیں دیا سلائی روشن کرتی نظر آئی۔ ایک مدھم سا دیا جل اٹھا۔ پرچھائیں اندر چلی گئی اور باہر آ کر کہیں دیکھنے لگی!

”مکدھر دیکھ رہے ہو؟“ پولیس افسر نے ہتھکڑیاں کھینچیں۔ وہ چٹان پر منہ کے بل گرا اور بولا۔ ”اپنے پکے مکان کی طرف۔“

سب لوگ کرخت قہقہے لگاتے ہوئے اسے کھینچ کر آگے جانے لگے! ایک بولا۔ ”لیکن یہ یارو کے مکان میں کون تھا۔“

”کوئی کتیا دیتا ہوگی۔“ پولیس افسر بولا۔

اور ٹھندی ہتھکڑیاں یارو کو اپنی کلائیوں پر ٹانگوں کی طرح لپٹی ہوئی معلوم ہوئیں۔



ہے، کہ پتھر چنگاریاں بھی اگل سکتے ہیں! کیا میرے سینے کی راکھ میں ابھی تک کوئی انگارہ دبا پڑا ہے!“ اور اس نے اپنے سینے کو ٹٹولا۔ ابھری ہوئی ہڈیوں نے جیسے اس کی انگلیوں کو ڈس لیا! اس نے ایک بار پھر ننھے سے پتھر کو چٹان سے نکلرایا اور چند چنگاریاں چمک کر بجھ گئیں۔ اس نے پتھر کو ہوا میں اچھال دیا جو نیچے گر کر لڑھکا اور ایک نودمیدہ پودے کی جڑ کے پاس رک گیا۔ پودے کا سارا وجود کپکپا کر پھر سیدھا ہو گیا۔ شریف اٹھا۔ انگڑائی لے کر اس نے اپنی انگلیاں چٹکانیں اور اوپر نیلے آسمان پر ان دو بادلوں کو دیکھنے لگا جو پردہ نشین لڑکیوں کی شکل اختیار کر کے جیسے پر سکون سمندر پر تھرکتی جا رہی تھیں! —

”سب جھوٹ! سب غلط۔ سب بکواس!“ — اور سینے کو یوں سختی سے ملا، جیسے اس نے اس کے اندر دیکھے ہوئے تمام خیالات کو مسل ڈالا ہے۔

ہولے ہولے وہ ڈھیری پر چڑھنے لگا۔ ایک جھاڑی کے سائے میں سے چھاگل اٹھائی کہ پانی پی لے مگر اچانک اسے الٹ دیا۔ ”باسی پانی!“ وہ بولا۔ خالی چھاگل ہاتھ میں لٹکا کر وہ ڈھیری کے گرد گھومتی ہوئی پگڈنڈی پر سے ہوتا ہوا ایک طرف نکل گیا۔ آسمان پر بادل ناپید ہو گئے، مرلی رک گئی اور ایک ہرا بندوق کی گولی کی سی آواز پیدا کرنا ایک کبوتر کے تعاقب میں ڈھیروں سے ورے غائب ہو گیا۔

شریف چھاگل بھر کر واپس آیا، تو اس کا دماغ بالکل خالی تھا۔ جھاڑی کے قریب ایک بہت بڑے پتھر کو لڑھکا لایا۔ اس پر چادر رکھی اور ایک بار بھیڑوں کی طرف دیکھ کر پتھر پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

دھوپ کی وجہ سے اسے اپنے پتلے پتلے پونوں سے پرے پیلا پیلا اندھیرا نظر آیا اور پھر اس اندھیرے میں لہریں اٹھنے لگیں۔ اندھیرا رنگ بدلنے لگا۔ سبزی مائل پس منظر پر اچانک بہت سے ہیولے ابھرے، جن کے خطوط گو واضح نہ تھے لیکن شریف کا جی چاہا کہ یہ ہیولے ان بل کھاتی ہوئی لہروں سے

چھاگل

کھیت کے کنارے ادھیر عمر شریف ایک ننھے سے پتھر کو ایک بڑی چٹان سے بجا رہا تھا اور کھیت کے قریب ابھری ہوئی ڈھیری کی گول چوٹی پر بھیڑیں چ رہی تھیں۔ آسمان پر دو بادل اونٹوں کی شکل اختیار کر کے افق کی طرف بھاگے جا رہے تھے، اور دور نیم کے ایک گنجان درخت کے نیچے کوئی چرواہا بیٹھا مرلی بجا رہا تھا۔ مرلی کے تیز سرفضا کے لامحدود خلاؤں میں تیز پر بھونروں کی طرح تیرتے پھر رہے تھے اور شریف کے پتھر کی ٹھک ٹھک جیسے اس ابدی نغمے کے لئے تال کا کام دے رہی تھی۔

اچانک پتھروں میں سے دو چنگاریاں نکل کر بجھ گئیں اور شریف کا ہاتھ رک گیا۔ مرلی کے تیز سر اس کے کانوں کے قریب پھڑپھڑانے لگے اور اس نے پلٹ کر مرلی بجانے والے کی طرف دیکھا۔ ڈھیلے ہونٹوں میں تناؤ پیدا ہوا، بے رنگ جڑے نمایاں ہوئے، جھولتے ہوئے پیلے دانت دکھائی دیتے، اس کی ننھی ننھی دھندلی آنکھوں میں اک مبہم سی چمک آئی، وہ مسکراتے لگا۔ اس کے سینے میں مہین دھول کی تھوک کے نیچے سے ایک خیال نے سر نکالا اور اچھل کر اس کے دماغ میں آ بیٹھا۔ شریف سوچنے لگا۔ ”مرلی بجانے والے“ تو مرلی میں اپنے من کی آگ پھونک رہا ہے اور میں اس آگ کی لپٹیں محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تو جوان ہے، جوانی آگ ہے، اور آگ کا کام شعلے بھڑکانا ہے۔ میں بوڑھا ہوں، بوڑھاپا پتھر ہے۔ لیکن آج مجھے پہلی بار معلوم ہوا

نکل کر اس کے قریب آجائیں اور اس آرزو کے پیدا ہوتے ہی ان بے شمار ہیولوں میں سے ایک پر چھائیں سی آگے بڑھی اور اس کے بہت قریب آگئی۔

”فاطمہ!“ وہ پکارا۔ اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ پاس ہی چرتی ہوئی بھیڑیں ڈھیری کی طرف دوڑ گئیں اور ارد گرد پہاڑیوں نے بیک وقت ”فاطمہ!“ کی گونج پیدا کر دی۔ شریف کا چہرہ برسوں کے سوکھے ہوئے چہرے کی طرح بے نور ہو گیا۔ ڈھیلے ہونٹ کانپنے لگے، اور آنکھوں کے سامنے پیلے اور سبز تارے ناچنے لگے۔ چند لمحوں سے تپے ہوئے خلا میں گھورتا رہا اور پھر سر کو چادر پر اچھی طرح جما کر آنکھیں بند کر لیں مگر فوراً ”کھول دیں اور پیٹھ کے نیچے سے پتھر نکال کر پرے پھینک دیا! ہاتھوں کو سینے پر باندھ کر اس نے آنکھیں پھر بند کر لیں۔ لیکن اب اس پیلے اندھیرے کی بکراں و سعتوں میں نہ لہریں انھیں نہ بے شمار ہیولے ابھرے۔ صرف فاطمہ اشکوں بھری پلکوں کو جھپکاتی اس کے اس قدر قریب آگئی کہ شریف نے اس کی گرم گرم سانسیں اپنے ماتھے سے مس کرتی محسوس کیں۔ شریف کے جسم کے ہر ذرے سے بے ربط سی دھڑکنیں بلند ہونے لگیں، اور پھر فاطمہ کے نیلے ہونٹ وا ہوئے اور وہ بولی۔ ”تو نے میری امیدوں کی پکی ہوئی کھیتی کو جلایا! تو نے میرے حسن و خوبیوں کو بھول سکا! تو نے مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کیں! مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میری روح میں کوئی ان دیکھا ہاتھ شد کی پوچھ رہا ہے! لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ شد کے ان قطروں میں میری جوانی کا زہر چھپا ہوا تھا۔ تو نے میرا نام لے کر گلی گلی اپنی فانی محبت کے گیت گائے۔ تو نے مجھے گھر گھر بدنام کیا۔ ان دنوں مجھے اس بدنامی پر ناز تھا لیکن تو مجھے چھوڑ کر پولیس میں بھرتی ہو گیا، اور یہی بدنامی میری روح کا گھن بن گئی! تو بے وفا ہے، تو فریبی ہے، تو کمینہ ہے۔ تجھے انسان سمجھنے والے حیوان ہیں! تجھے زندہ سمجھنے والے مردہ دماغ ہیں۔ تو حیوان ہے، تو مرچکا ہے۔ اس دن سے مرچکا ہے جب تو سر پر لبا طرہ رکھ کر اور کھڑکھڑاتے ہوئے

لٹھے کی چادر باندھ کر لاہور چلا گیا تھا۔ بد قماش، جب تو چھٹی پر واپس آیا اور تجھے معلوم ہوا کہ میں نے اپنے باپ کی افیون چرا کر کھالی تھی اور تیرے جانے کے ہفتہ بھر بعد قبر میں جاسوئی تھی تو تیری آنکھوں سے ایک آنسو تک نہ ٹپکا۔ تو میری قبر پر بھی نہ آیا۔ تو نے صرف ایک دوست سے میرا ذکر کیا اور اس سے بھی صرف اتنا کہا۔ ”اس گاؤں کی لڑکیوں کے پاس نہ فاطمہ جیسی چکنی پنڈلیاں ہیں نہ ریشمی گال!“ — تف ہے تجھ پر۔ تف ہے! تف ہے!“ — اور شریف نے محسوس کیا جیسے فاطمہ نے اس کے منہ پر تھوک دیا ہے۔ غصے میں بیتاب ہو کر وہ فاطمہ پر جھپٹا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ ایک بھیڑ اس کے منہ سے منہ لگائے کھڑی تھی، اور جب شریف نے اس کے پیٹ پر ایک گھونسا مارنا چاہا تو وہ اس زور سے چھینکی کہ شریف دیر تک اپنا جھروں بھرا چہرہ پونچھتا رہا۔

اس کا دماغ انگارہ بن گیا اور اس انگارے کی حدت سے اس کی نس نس تانے کے باریک تاروں کی طرح تپ گئی۔ ہر پہاڑی کی چوٹی پر اسے فاطمہ ہاتھ پھیلا پھیلا کر پھنکارس بھیجتی نظر آئی۔ اس تکلیف دہ خیال کو دل سے نکالنے کے لئے وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ قمقموں سے تنگ کھاڑیاں گونج اٹھیں اور ساری کائنات کو اس خوشی میں شامل دیکھ کر اسے آس پاس ایسی آواز سنائی دینے لگی جیسے دہکتے ہوئے انگاروں پر پانی چھڑکا جا رہا ہو۔ ”اونہ“ اس کے سینے کی راکھ سے ایک اور خیال اچھلا ”محبت اٹھائے پھرتی ہے۔ لطف تو تب تھا کہ تو میرے پیچھے پیچھے لاہور چلی آئی، یہاں افیون کھا کر مر گئی تو کونسا تیرا مارا“ — اور یہ خیال پھر اسی راکھ میں دبک گیا۔ اسے ہر طرف پتھر کی ٹھک ٹھک سنائی دینے لگی اور اس نے جھٹ اپنے دونوں خالی ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ پھر دور گنجان نیم کی طرف اور اس کی نظریں نیم کے پاس ابھرتی ہوئی پہاڑیوں کے دامن پر سے ہوتی، اسی جگہ آ کر رک گئیں جہاں وہ خود پتھر بجاتا رہا۔ ایک لڑکی سر جھکائے اسی چٹان پر پتھر بجا رہی تھی۔

”ٹھیک ہے“ شریف بولا۔ ”لیکن ہوا سے پیاس بجھ سکتی تو خدا پانی پیدا ہی کیوں کرتا۔“

”جی ہلا واسمجھ لو۔“ وہ مسکرائی اور اس کے موتیوں کے سے دانتوں پر دھوپ نے ایک آسمانی چمک پیدا کر دی۔

شریف کے سینے کی راکھ میں سے بہت سے خیالات نکل کر خانہ بدوش بونوں کی طرح تاپنے لگے اور وہ اپنے استخوانی ہاتھ کو سینے پر مل کر بولا۔ ”لیکن اگر تمہیں پانی مل جائے؟“

”تو خدا کا شکر ادا کروں گی۔“

”اور میرا؟“ شریف کے دماغ میں ایک خیال اچھل کر چلا یا۔ بہت مشکل سے اس نے اپنے دماغ کی باغی سپاہ کی روک تھام کی اور بولا۔ ”تو چلو میرے ساتھ، وہ سامنے جھاڑی تلے چھاگل دھری ہے، ابھی ابھی بھر کر لایا ہوں۔“

وہ آہستہ آہستہ ڈھیری کی طرف چلنے لگا۔ پلٹ کے پیچھے دیکھا تو لڑکی سر جھکائے آرہی تھی اور ہوا کی وجہ سے اس کے بال اس کے چہرے پر بکھر بکھر جاتے تھے۔ شریف نے سوچا کیا ہی اچھا ہوتا اگر میں ڈھیری کی طرف جانے میں اس قدر تیزی نہ کرتا۔ وہ آگے چلتی، میں اس کے پیچھے پیچھے ہوتا اور دیکھتا کہ اس کے پاؤں کیسے اٹھتے ہیں، اس کا آنچل کیسے پھڑپھڑا کر اس کے سر سے اڑ جاتا ہے اور اس کے بال کس طرح ہوا میں ایک جالا سا بن کر اس کے شانوں پر بکھر جاتے ہیں۔ اس کے ہاتھ، اس کی پیٹھ، اور شاید اس کی پنڈلیاں بھی! — پنڈلیوں کا خیال آتے ہی اسے فاطمہ یاد آگئی اور وہ اس قدر پریشان ہو گیا کہ سر کو جھٹک جھٹک کر بڑی مشکل سے یہ پرچھائیں باہر نکالی۔

اسے سر جھٹکا دیکھ کر لڑکی بولی۔ ”تمہارے سر میں درد ہے شاید؟“

وہ جان بوجھ کر زور سے کھانسا۔ لڑکی کا ہاتھ رک گیا اور اس نے پلٹ کر شریف کی طرف دیکھا۔ دونوں بھری آنکھیں اوپر فضا میں اٹھ کر شریف کے سامنے آگئیں اور ان کی صاف چلیوں میں اسے اپنا عکس نظر آنے لگا۔ وہ ایک بار جھپکیں اور کھلیں اور شریف کا دل سٹا اور پھیل گیا۔ پھیلتا گیا حتیٰ کہ وہ لڑکی اس کے دل کی زد میں آگئی۔ شریف نے ایک بار کھٹکار کر ان پر چھائیوں کو پرے ہٹ دیا اور چٹان کی طرف دیکھا تو ٹھک ٹھک اسی طرح جاری تھی۔

نہایت آہستہ آہستہ وہ ڈھیری سے اتر کر چٹان کے قریب پہنچ گیا اور جب لڑکی نے ایک بار پھر اس جھاڑی کی طرف دیکھا جہاں شریف لیٹا ہوا تھا تو شریف کو وہاں نہ پا کر اس نے نظریں ادھر ادھر دوڑائیں۔ شریف مسکرایا۔ بے رنگ جڑوں میں لٹکے ہوئے پیلے پیلے دانتوں پر دھوپ نے ایک آئینی سی چمک پیدا کر دی۔ ”تم کس کی لڑکی ہو؟“ وہ اپنی بھاری آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔

لڑکی نے پتھر کو ہاتھ میں گھمایا اور بولی۔ ”تم میرے باپ کو نہیں جانتے۔ میں یہاں کی رہنے والی نہیں، میرا وطن میدانوں میں ہے۔ ہم یہاں بیل چرانے آئے ہیں کیونکہ ہمارے وطن میں آج کل قحط پڑا ہوا ہے۔“

”بیل کہاں ہیں تمہارے؟“ شریف نے اس کے خیدہ لبوں کے گوشوں کی پھڑکن دیکھنے کے لئے سوال پوچھا۔

اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ”بیل تو ان ڈھیروں کے پرے چ رہے ہیں۔ میں پانی کی تلاش میں ادھر آئی تھی مگر مجھے تو یہاں کوئی چشمہ، کوئی جھرنّا نظر نہیں آیا۔ یہاں سامنے درے سے ٹھنڈی ہوا آرہی ہے اس لئے میں نے کہا۔ چلو ٹھنڈا پانی نہیں، ٹھنڈی ہوا ہی سی۔ ہمیں پیاس بجھانے سے کام ہے۔“

اور شریف کے جسم کا ذرہ ذرہ مسکرانے لگا۔ ”ہاں ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے درد ہو رہا ہے۔“

”ہوا سے بچ کر دھوپ سینکو۔ ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ وہ بولی۔

اور شریف کے دماغ میں کسی نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ ”لیکن کیا تم میرے سر کو نہیں دباؤ گی؟ میری عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہے اور تم پندرہ سولہ سال کی معصوم لڑکی ہو۔ تمہیں کسی قسم کی جھجک نہیں ہونی چاہیے۔ تمہیں۔۔۔ لیکن اب شریف جھاڑی کے قریب پہنچ گیا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ لڑکی کو بست دیر تک روکے رکھے لیکن اس وقت چھاگل اٹھانے کے سوا اسے اور کوئی بات نہ سوجھی۔

چھاگل اٹھا کر اس نے لڑکی کی طرف دیکھا اور ایک ہی نظر میں اس کے سب خدوخال کا جائزہ لے لیا۔ اس مختصر وقفے میں اس نے سوچا۔ ”اس کے بال یوں تو عام لڑکیوں کی طرح ہیں۔ لیکن انہیں ہوانے اس کے چہرے پر بکھیر کر غضب ڈھایا ہے۔ آنکھیں بست غیر معمولی طور پر خوبصورت نہیں لیکن پیاس بجھنے کی خوشی میں ان میں جو چمک سی آرہی ہے یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ اب میں کیا کہوں، جیسے اندھیرے پورب پر پو پھٹ رہی ہے! اور یہ خمیدہ لبوں کے گوشوں کی پھڑکن اور یہ خوبصورت ناک کا سرخی مائل بانسہ اور یہ۔۔۔ یہ۔۔۔“ وہ اور نہ سوچ سکا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ لڑکی کو گھور رہا ہے اور وہ اسے اچھا نہیں سمجھ رہی۔ اس کی نظریں پتھروں کی طرح گر گئیں اور وہ دو قدم آگے بڑھا کر بولا۔ ”چھاگل منہ سے لگا لو۔“

”نہیں میں اوک سے پی لوں گی۔“ لڑکی اوک بنا کر ٹھوڑی پر جما کر بولی۔

”یہ ٹھیک ہے۔“ شریف نے سوچا۔ چھاگل کا منہ کھول کر وہ اور آگے بڑھا اور ایک پتلی سی دھار گلابی اوک میں ابھرتے اور پھٹتے بلبلوں کا ایک

نخسا سا طوفان اٹھانے لگی۔ تیزی سے شریف نے لڑکی کے روشن ماتھے کی اس لکیر کو دیکھا جہاں سے اس کے بال شروع ہو رہے تھے اور ماتھے کے ابھار سے اس کی نگاہیں پھسلتی اس کے ابروؤں پر آکر گئیں، یہاں سے اس نے دائیں بائیں اس کے ریشمی چھتی پتلی ناک پر آکر جم گئیں، یہاں سے اس نے دائیں بائیں اس کے ریشمی گالوں پر کانپتے ہوئے پانی کے قطروں کو دیکھنے میں بست دیر لگا دی۔ لال گالوں پر پانی کے قطرے بھی لال ہو رہے تھے، اور پھر اچانک شریف نے لڑکی کے خمیدہ ہونٹوں کو پانی میں ڈوبے ہوئے دیکھا تو اس کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ ان ہونٹوں پر۔۔۔ ان نیم وا ہونٹوں پر ایک بار بس ایک بار۔۔۔ صرف ایک بل کے لئے۔۔۔ آنکھ کی مختصر جھپکی کے وقفے کے لئے۔۔۔ بس ایک بار۔“

اور لڑکی چیخی۔ ”تم نے تو سارا چہرہ بھگو دیا۔۔۔ تم کس سوچ میں ہو؟“

اور جب تک لڑکی بولتی رہی، چھاگل میں سے نکلتی ہوئی پانی کی دھار اسی طرح اس کی نامکمل اوک کے کنارے پر پڑتی رہی۔ اور پھر جب اچانک اس نے چھاگل کا منہ بند کر لیا، تو ننھے ننھے قطروں کی ایک پھوار سی لڑکی پر برس پڑی اور وہ آنکھ مل کر بولی۔ ”تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں تو ٹھنڈے سے اکڑ جاؤں گی۔ ہوا بھی ٹھنڈی ہے، پانی بھی پی لیا ہے، کپڑے بھی بھیک گئے ہیں۔“ اور شریف یہ الفاظ سننے کے بجائے اس کے ہونٹوں کی حرکت دیکھتا رہا۔۔۔ ایک بار۔۔۔ صرف ایک بل کے لئے ان ہونٹوں پر۔۔۔“

اس نے اپنے ڈھیلے ٹھنڈے ہونٹوں کو ملا۔ اس کے سینے میں بے شمار خیالات ہر طرف غبار اڑاتے ابھرے اور اس کے دماغ میں آکر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ اس نے چاہا بڑھ کر ان گلابی ہونٹوں کو مس کر لے اور اس نے ایک قدم اٹھایا بھی! لیکن وہ رک گیا، لڑکی اس کی طرف دیکھ رہی تھی! ”کیا بات ہے؟“ لڑکی نے اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر پوچھا۔

شریف کی زبان پتھر بن گئی اور جب بڑی کوشش سے وہ اسے حرکت دینے میں کامیاب ہوا تو بولا۔ ”یہ چھاگل تم لیتی جاؤ۔ تم پر دبی ہو، پانی کی تکلیف ہوتی ہوگی تمہیں۔ اب یہ آدمی بھری ہوئی ہے، کل گاؤں سے بھرتی لانا۔ دن بھر کام آئے گی۔ میں اور لے لوں گا۔ میرے پاس اور بہت سی چھاگلیں ہیں۔ لے لو۔ کوئی بات نہیں۔ لو۔ لے بھی لو۔“

اور سمٹی ہوئی لڑکی کو چھاگل تھمتے وقت اس نے کوشش کی کہ اس کی انگلی کو اپنی انگلی سے چھو لے، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا اور لڑکی مسکراتی ہوئی پلٹی، ڈھیری سے اتر کر کھیتوں میں سے گزرتی سامنے پہاڑیوں میں ایک پگڈنڈی پر سے ہوتی ایک موڑ مڑ کر غائب ہو گئی۔

شریف ہولے ہولے ڈھیری سے اترتا اسی چٹان کے پاس آیا۔ ایک بہت لمبی اور گہری سانس لے کر اس نے آنکھیں ملیں اور ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کا جسم جذبات کی شدت سے تپ کر کانپ رہا تھا۔ اسے پیاس محسوس ہوئی۔ پیاس محسوس ہوتے ہی وہ آنکھیں جھپکاتے لگا۔ تیزی سے ادھر ادھر دیکھا۔ دور پگڈنڈی کے موڑ کو گھور کر وہ چٹان پر بیٹھ گیا اور تیز تیز سانس لینے لگا۔ اس کے دماغ میں ایک خیال اچھل اچھل کر پکارا۔ ”بگے تو اسے چھو تک بھی نہ سکا اور چھاگل بھی دے بیٹھا۔ شاید پانی کے لالچ سے وہ روز یہاں آتی۔ لیکن اب اسے چھاگل مل گئی ہے۔ وہ پہاڑوں کے پرے ہی رہے گی اور تو یہاں پیاس سے مرتا رہے گا۔ ارے یہی تو وہ چھاگل تھی جس میں فاطمہ تیرے لئے کھانڈ کا شربت بھرا لائی تھی! بگے۔ بوڑھا کھوسٹ!“

شریف دماغ میں گونجتے ہوئے ان طوفانوں کی تاب نہ لا کر اٹھا اور ایک پتھر اٹھا کر چٹان سے بجانے لگا۔ ایک بار چند چنگاریاں نکلیں مگر فوراً بجھ

گئیں۔ فوراً!“

اور شریف کے دماغ میں جیسے کوئی ادھ بھری چھاگل چھلکانے لگا! — چھاگل — چھاگل — چھاگل! ☆